شمارہ: ۲۲



دینی، علمی، تحقیقی، تاریخی اور سوانحاتی

مجلہ

احوال و آثار

کاندھلہ

اشاعت محرم الحرام ۱۴۳۷ھ / اکتوبر ۲۰۱۵ء

مرتب:

نور الحسن راشد کاندھلوی



مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

محلہ مولویان، کاندھلہ، ضلع شاملی

دینی، علمی، تحقیقی، تاریخی اور سوانحاتی

شمارہ:۲۲

مجلّہ احوال وآثار کاندھلہ

اشاعت محرم الحرام ۱۴۳۷ھ - اکتوبر ۲۰۱۵ء

مرتب
نورالحسن راشد کاندھلوی

ضروری اطلاع: آئندہ شماروں کی اشاعت کے لئے مقررہ مدت کی بات ختم کی جارہی ہے، جب مضامین جمع ہوجائیں گے اور موقع ہوگا شمارہ شائع کردیا جائے گا۔

اس شمارہ کی قیمت پچھتر [۷۵] روپئے

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی
مولویان کاندھلہ، ضلع شاملی (مظفرنگر) (یوپی) انڈیا ۲۴۷۷۷۵
Mb.09358667219 Emali: muftielahibakhshacademy@gmail.com

فہرست مضامین

اس شمارہ کی قیمت: ہندوستان میں پچہتر [۷۵] روپے
مغربی ملکوں میں تین [۳] امریکی ڈالر

پاکستان کے شائقین

جناب سجاد الٰہی صاحب

A/27----مال گودام روڈ۔لوہا بازار۔بادامی باغ۔لاہور

Mb.0300-4682752

سے رجوع فرمائیں۔

ادار یہ

گفتنی ونا گفتنی

بقلم[مولانا] ضیاءالحق خیرآبادی ☆

کئی سال کے طویل وقفے کے بعد ''احوال وآثار'' کا یہ شمارہ طباعت کے لئے جا رہا ہے، اس موقع پر چند باتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔



ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سے مذاہب کے ماننے والے اور مختلف افکار ونظریات کے حامل افراد رہتے بستے ہیں، یہاں صدیوں سے باہمی اتحاد اور مذہبی رواداری کی روایت قائم ہے، یہاں کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان باہم شیر وشکر کی طرح ہیں تحریک آزادی میں بھی دونوں کا اتحاد مثالی اور غیر معمولی تھا، مگر اس وقت بھی ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس جیسی تنظیمیں منافرت کا زہر گھولنے میں مصروف تھیں، انگریز بھی اپنے مفاد کے پیش نظر اسے ہوا دیتے رہے، ادھر جب کاروانِ آزادی اپنی منزل پر پہونچا تو ملک کی آزادی، تقسیم کی خوفناک صورت میں ظاہر ہوئی، جس نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بہت دوری پیدا کردی، جس سے فرقہ پرست تنظیموں کو بہت طاقت ملی اور ان کو اپنے مشن کی کامیابی کا ایک ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ یہ تنظیمیں ایک منظّم انداز اور پلان کے تحت، پورے ملک پر چھاتی چلی گئیں، پھر وہ دور بھی آیا کہ مرکز میں ان کی حکومت قائم ہوگئی، اور ان کو پوری طرح سے کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

ایک طرف تو ملک کے جمہوری کردار اور سیکولر دستور کو ختم کرنے کی سازش اور تیاری شروع ہوگئی، دوسری جانب فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ سے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت وعداوت کی خلیج پیدا کرنے اور اس کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے، منصوبے اور محنت تیز تر ہوگئی، جس کے نتیجہ میں ہندو مسلم اتحاد اور بین المذاہب رواداری کو سخت خطرہ پہنچا ہے اور متواتر پہنچ رہا ہے۔ صدیوں سے جس مثالی انداز میں، تمام مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے، وہ ہندوستان کی مایہ ناز تہذیب کا حصہ تھا، مگر اس وقت جو صورتحال ہے، اس میں باہمی منافرت دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے، یہ انتہائی پریشانی کی بات

☆ **مدرس: مدرسہ تحفیظ القرآن**
مبارک پور، اعظم گڈھ

ہے، ہندوستان کی سالمیت اور خود مسلمانوں کے تحفظ کے لئے خطرہ کی گھنٹی ہے، جس نے ملک کے تمام باشعور اشخاص اور دانشوروں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ فرقہ پرست لابی جسے مرکزی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، اپنے ایجنڈے پر زور وشور سے کام کر رہی ہے، ہندو مسلمانوں دونوں کی نوجوان نسل، غلط فہمیوں کا شکار ہے اور ایک دوسرے سے دور ہوتی جا رہی ہے، جس کے اثرات ہر جگہ اور ہر سطح پر ظاہر ہو رہے ہیں۔



مظفر نگر کے فرقہ وارانہ فسادات [ستمبر ۲۰۱۳ء] کے بعد سے جو نئی صورتحال سامنے آئی ہے، اس نے ارباب فکر ونظر کو اس بات کی جانب متوجہ کیا، کہ اس بڑھتی ہوئی دوری کو ختم کرنے کیلئے، طاقت ور مؤثر اور بھر پور کوشش کی جائے۔ ملت اسلامیہ اور ملک کو، آئندہ پیش آنے والے حالات کی فکر کرتے ہوئے، مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم وتربیت، ان کے ایمان وعقیدہ کے استحکام اور ان کے اخلاق وکردار کی آبیاری کے لئے، متواتر جدوجہد کی جائے اور جہاں تک بن پڑے، ان کو ملت اسلامیہ اور انسانیت کی خدمت کے لئے، بہتر سے بہتر صورت میں تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ مدارس اسلامیہ اس سلسلہ میں مؤثر اور بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں، لیکن ان پر بھی ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہے، اکثر مدارس میں بنیادی کام کی اور اس ضرورت پر توجہ میں، خاصی بلکہ واضح کمی نظر آ رہی ہے، حالانکہ مدارس کا سلسلہ تو درحقیقت اسی لئے شروع ہوا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے سامنے آنے والے، ہر طرح کے حالات اور مسائل کا دانش وفکر، حوصلہ مندی اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے اور حالات کو بہتر سے بہتر بنانے کی، مسلسل جدوجہد کی جاتی رہے۔ اچھے طالب علموں کی تیاری کی محنت اور ایسے علماء کے وجود میں لانے کی بھر پور کوشش، جو اپنے اپنے علاقوں میں، ملت کی اجتماعی ضروریات اور نئے سامنے آنے والے مسائل، فتنوں اور دین وعقیدہ کے لئے، خطرہ بننے والے چیلنجوں کا، اس طرح مقابلہ کرتے، کہ ان سب کا رخ پھیر دیتے، اور امت کے افراد کو صاف صاف نظر آتا کہ ؎

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں زمانے میں

مگر افسوس ایسے افراد کا وجود قصہ کہانی بنتا جا رہا ہے۔، اب تو صورتحال یہ ہے کہ نہ اپنی فکر ہے، نہ اپنے نوجوانوں اور نسلِ نو کی اور نہ ملت کے سر منڈلانے والے، خطرات ونقصانات کی۔ اس لئے ضروری کہ ہم اپنی غفلت دور کریں، اسلامی تعلیمات اور سیرت نبوی کی روشنی میں، اسلام صحیح کی تعلیمات کو عام فرمائیں اور اسلام پر ہونے والے نئے شبہات واعتراضات کے، واضح اور اطمینان بخش جواب فراہم

کریں۔ ذرائع ابلاغ پر پھیلائے ہوئے شکوک وشبہات کو دور کریں اور اپنے بچوں، نوجوانوں کو اعلیٰ اسلامی اخلاق وکردار اور مذہبی رواداری کے ذریعہ سے اپنے سے قریب کریں، اور انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرکے، پُرسکون اور قومی اتحاد واتفاق والی زندگی گزارنے کے لئے تیار کریں۔ مسلمانوں غیر مسلموں کی نئی نسلوں اور اپنے ملک کے عوام کے سامنے، تحریک آزادی کے مشترک مقاصد اور مشترک کام کو عام کریں، مسلم وہندو لیڈران اور علماء کرام کے مثالی اتحاد کی تاریخ کو سب کے سامنے پیش کریں، جہاں یہ دونوں قومیں شیر وشکر کی طرح رہتی تھیں۔

اسی بڑے مقصد اور کام کے لئے، اکابر علمائے کرام اور ارباب فکر ودانش کے مشوروں اور مقامی حضرات کے تعاون سے، مظفرنگر میں ایک بڑا دوروزہ پروگرام ''محبت انسانیت اور مذہبی رواداری'' کے عنوان سے جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ۔فروری ۲۰۱۶ء میں منعقد کرنے کی تیاری ہورہی ہے، جس میں ملت کے علماء ومفکرین کے ساتھ، سیکولر ذہن کے دانشوروں کو بھی مدعو کیا جارہا ہے، جو ملک کی صحیح صورتحال پیش کریں گے اور حالات درست کرنے کے لئے، اپنے تجربات اور خیالات سے آگاہ فرمائیں گے۔

اس کانفرنس میں ایک علمی نشست متوقع ہے، جس میں چند کتابوں کا اجراء کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ضلع مظفرنگر کی تاریخ اور یہاں کی دینی، علمی، ادبی، سیاسی وتاریخی شخصیات کے احوال وخدمات اور ان کے کارناموں پر مشتمل، ایک بڑی علمی نمائش کا بھی انتظام کیا جارہا ہے، امید ہے کہ یہ نمائش پروگرام کے بعد بھی چند دنوں تک جاری رہے گی۔ اس نمائش کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب مسلمان، خصوصاً اس علاقہ کے اصحاب وافراد کو، اس کے ذریعہ سے، اپنے روشن ماضی کی اور اپنے بڑوں کی غیر معمولی علمی، سیاسی خدمات اور تحریک آزادی میں بہت بڑے رہنمایانہ حصہ اور بے پناہ قربانیوں کی خبر ہو، وہ اس سے واقف ہوں اور خود کو احساس کمتری سے نکالیں۔

اللہ کرے صدق نیت اور خلوص قلب سے اٹھایا گیا یہ قدم، ملت کے حق میں مفید ثابت ہو، اور اس کی برکت سے، ملک کی موجودہ صورتحال میں خوشگوار تبدیلی آئے۔ پوری ملت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مشن کو آگے بڑھائے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش اور جدوجہد کرے۔



احوال آثار کا یہ شمارہ تقریباً چھے سال کے وقفہ کے بعد چھپ رہا ہے، مگر ایسا کیوں ہوا، اس کا بھی ان صفحات پر کچھ تذکرہ ہونا چاہئے۔ آج سے ٹھیک بائیس سال پہلے، ایک خاص دینی جذبے اور علمی خدمت کے خیال سے علمی وتحقیقی مجلّہ کی ابتدا ہوئی تھی، نیت اور جذبہ یہ تھا کہ اپنے تمام بزرگوں، اسلاف کرام، علماء

عظام واصحاب فکر وعمل کے آثار، نامعلوم احوال، یاان کے زندگی کی، نودریافت تازہ معلومات اوران کی نادر وغیر مطبوعہ چیزیں، اس رسالہ کے ذریعہ سے سامنے لائی جائیں، عام ہوتی رہیں، علماء کی قدیم مطبوعات کو عصر حاضر کے ذوق اور معیار کے مطابق مرتب اور شائع کیا جائے۔ اس خیال سے محرم ۱۴۱۵ھ۔ جولائی اگست ۱۹۹۴ء کواس کا پہلا شمارہ شائع کیا گیا تھا۔ اگر چہ رسالہ کواس کے غیر معمولی مندرجات کی وجہ سے، اہل علم کے حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، ہندوستان کے ہرطبقہ خیال کی ممتاز علمی شخصیات نے، اس کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا اور تحسین وآفریں سے نوازا۔ بعد کی اشاعتوں میں ان میں سے چند تحریریں اور خطوط شائع بھی کئے گئے تھے، جس کو پڑھ کر اس رسالے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

رسالہ کا جو بلند علمی معیار تھا اس کے لئے ضروری تھا، کہ اہل علم وتحقیق کی ایک جماعت، اپنے علمی وتحقیقی مضامین کے ذریعہ مدیر کا تعاون کرتی اور رسالہ کی تکثیر اشاعت کی کوشش کی جاتی، علماء اہل مدارس اور دانشور اصحاب اس کو خریدتے اور اس کے کام کو درجہ بہ درجہ آگے بڑھایا جاتا، لیکن افسوس کہ دونوں میں سے کوئی بھی توقع پوری نہ ہوئی، مضامین کی تحریر وکتابت سے لیکر طباعت واشاعت تک، تمام کام مدیر و مرتب تن تنہا انجام دیتے رہے اور دے رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسالہ کی اشاعت کا تسلسل برقرار نہ رہ سکا، اس کے شماروں میں لمبے لمبے وقفے اور التواء ہوتا رہا، لیکن مدیر کا جو عزم اور جذبہ و منصوبہ تھا، اس نے ہمت نہ ہاری اور جس طرح ممکن ہوا وہ اس کو شائع کرتے رہے۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ ان کے پاس نادر ونایاب جو بے شمار تحریریں، کتابیں، دستاویز و معلومات جمع ہیں جو بہت کوشش تلاش وجد وجہد سے، کثیر سرمایہ خرچ کر کے فراہم ویک جا کی گئی ہیں، ان کی اشاعت کی اور قدر دانوں تک پہونچنے کی صورت بنی رہے۔

مگر دینی وعلمی اور ادبی وتحقیقی رسالوں کی جو عمومی صورتحال ہے، وہی احوال وآثار کے ساتھ بھی ہوا ہے کہ اسے خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد، نہ ہونے کے برابر ہے۔ حوصلوں کو پست اور عزائم وارادوں کو مضمحل کر دینے والے، ان حالات کے باوجود، جب جب ہوسکا ''احوال وآثار'' شائع ہوتا رہا، حضرات اکابر کے نادر علمی مضامین وتحقیقات، اس کے ذریعہ محفوظ ہوتی رہیں اور ان کے ذریعہ سے علم وتحقیق کے نئے نئے گوشے سامنے آتے رہے۔ اسی طرح گرتے پڑتے، اب تک اس کے مجموعی طور سے، اکیس شمارے منظر عام پر آچکے ہیں، جس میں دو خصوصی اشاعتیں بھی شامل ہیں۔

لیکن اس صورت میں جب نہ علمی تعاون میسر ہو، نہ ہی مالی وسائل فراہم ہوں، رسالہ کو جاری رکھنا ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' سے کم نہیں، مگر اکابر کے سرمایۂ علمی کی حفاظت واشاعت کا خیال پھر بھی قائم اور حوصلہ برقرار ہے، ایک اور شمارہ چھاپ کر ایک مرتبہ اور کمر ہمت کسی جارہی ہے، نئی منزل کی جانب قدم

بڑھایا جا رہا ہے، لیکن سابقہ تجربات کی وجہ سے، اب ارادہ یہ ہے کہ اس کو سہ ماہی و ششماہی کی قید سے آزاد کر دیا جائے، جب مضامین مرتب ہو جائیں اور ان کی اشاعت کا سامان مہیا ہو جائے، شمارہ شائع کر دیا جائے۔ قارئین کی آراء کا بہرصورت انتظار و احترام کیا جائے گا۔

ہمارے اکثر دینی، علمی و تحقیقی رسائل کا یہی المیہ ہے کہ ان کے مضامین و تحقیقات کی مدح و توصیف خوب ہوتی ہے، داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں، مدیر کی اصابت رائے و رسوخ علم و فکر کی داد دی جاتی ہے، ذوق اشاعت علم کی خوب واہ واہ ہوتی ہے، لیکن جب بات خریداری اور توسیع اشاعت کی آتی ہے تو وہ تمام مدح و تحسین اور نیک جذبات و خیالات یکلخت سرد ہو جاتے ہیں اور ایسے رسائل و مجلّات کے ناشر اور مرتب، مسائل کے ہجوم میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ داد و تحسین، واہ واہ اور زندہ باد کے نعروں سے کوئی کام، ادارہ، مرکز یا رسالہ زندہ نہیں رہ سکتا، اس کے لئے مالی اور افرادی دونوں ہی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، مالی وسائل میسر ہوں تو اچھے اور لائق افراد بھی مہیا ہو سکتے ہیں۔ اب اس سلسلے کو باقی رکھنے، اس میں زندگی اور اس حرارت و توانائی بخشنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ رسالہ کی توسیع اشاعت اور مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کی مطبوعات کی خریداری میں دلچسپی لی جائے، ان کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں پہنچایا جائے۔ نقد و تبصرہ کے ذریعہ ان کی خوبی خامی کو واضح کیا جائے، اسے بہتر اور خوب سے خوب تر بنانے کے لئے، مشورے پیش کئے جائیں۔

اللہ کرے یہ الفاظ و کلمات اس کے، مستقبل کے ارادوں کے لئے نیک فال ثابت ہوں اور اس کے ذریعہ سے علم و تحقیق کا یہ سفر جاری رہ سکے۔

ضیاء الحق خیرآبادی ☆

۲۴/ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۹/اکتوبر ۲۰۱۵ء بروز جمعہ

☆ نامور عالم اور مصنف، مولانا اعجاز الحق اعظمی [شیخوپور] کے خاص تربیت یافتہ شاگرد، ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپورہ۔ اعظم گڈھ کے مدیر و مرتب!

برصغیر ہند کی مذہبی شرعی حیثیت

اور یہاں مسلمانوں کے لئے بعض معاملات کا حکم؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے تین نادر اور تاریخی فتوے

نور الحسن راشد کاندھلوی

ہندوستان میں مسلمان فاتحانہ حیثیت سے آئے تھے، اپنی اس آن بان اور فاتحانہ حیثیت و مرتبہ کو انہوں نے صدیوں تک باقی رکھا اور اس کے جاہ و مرتبت میں ہر طرح سے اضافہ کرتے رہے، یہ عروج اقتدار، جاہ و حشم خاندان مغلیہ کے آخری، عالی مرتبت حکمراں، اورنگ زیب عالمگیر کی وفات [۲۸/ذی قعدہ بروز جمعہ ۱۱۱۷ھ۔ مارچ ۱۷۰۶ء[1]] تک باقی رہا اور ترقی کرتا رہا، اس درمیان اگرچہ اکثر حکمراں ایسے آئے کہ ان کو عملاً اسلام کے قواعد و قوانین، نظام مملکت کے اسلامی بنیادوں پر قائم و استوار ہونے نہ ہونے، اور عوام کی دینی شرعی زندگی سے بہت تعلق نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود، کسی کی جرأت و ہمت نہیں ہوئی کہ وہ نظام حکومت سے اسلام کو یکسر بے دخل کر کے، حکومت کے لئے کسی اور نظام و قانون کے نافذ ہونے کا اعلان کر سکتا۔

اگرچہ اکبر [جلال الدین محمد۔ م ۱۳/ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ۔[2]، اکتوبر ۱۶۰۵ء] کا طریقۂ حکمرانی اور فکر و مزاج، تمام حکمرانوں سے جدا اور غیر اسلامی اصولوں، طریقوں پر مبنی تھا، اس نے نظام مملکت کو اسلام کی راہ سے ہٹانے کے لئے، خاصی کوشش بھی کی تھی، مگر اس کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ پورے ملک کو، معمول و مروج اسلامی طریقوں سے ہٹ کر، نئے راستہ پر چلنے کی ہدایت اور اس کا اعلان عام کرتا، مملکت میں نئے

---

(۱) تاریخ ہند ــــ مولوی ذکاء اللہ دہلوی ــــ ص:۴۶۵[4539] ج۶[عکس طبع اول قدیم۔ سنگ میل پبلیشرز لاہور: ۲۰۱۰ء]

(۲) ذکاء اللہ ص:۶۰۶ ج۵[2768]

غیر اسلامی نظام کے نافذ کرنے اور اس پر عمل کرانے کی جدوجہد کرتا۔شاہی محفلوں یا دارالحکومت میں جو کچھ ہو رہا تھا، اسلام اور اسلامی اصول وقوانین کو نظر انداز کرنے، بھلانے کی جو کوشش ہو رہی تھی، وہ کوشش ملک میں، اگر چہ اثر انداز تھی، مگر اس کی وجہ سے ویسی بڑی اور پرزور تبدیلی نہیں آئی، جس کی اربابِ اقتدار امید کر رہے تھے، تاہم کچھ غیر اسلامی رسومات ، ہندوانہ طور طریقے، مسلمانوں کی زندگی اور معاملات ومعاشرت میں داخل ہو گئے تھے، لیکن دینی طبقوں اور علماء کی طرف سے، اس فکر، ایسے نظریات اور طریقۂ کار کی مخالفت بھی پرزور تھی، جس کی وجہ سے عمومی اسلامی زندگی پر، سرکاری کوششوں کا ایسا بڑا اور ایسا گہرا اثر نہیں پڑا تھا کہ اس ملک کو، یہاں کے علماء، مجموعی طور سے دارالحرب یا دارالکفر قرار دینے کا فیصلہ کر لیتے۔

مگر اورنگ زیب کی وفات کے بعد، جیسے جیسے خاندان مغلیہ زوال کی طرف بڑھا، ان کے آپس کے اختلافات خون ریزی میں تبدیل ہوئے اور تخت نشینی کے شوق نے، بھائی کو بھائی کا، باپ کو بیٹے کا دشمن بنا دیا تھا، ایسے میں مخالفین حکومت، مخالفین اسلام کو سر اٹھانے، نظام حکومت کو ہلانے، غیر مستحکم کرنے کا خوب موقع ملا۔ایسے لوگوں، گروہوں کی غارت گری اور ان کے ذریعہ سے مسلم بستیوں کی تاراجی و بربادی کا سلسلہ، ایک شہر سے دوسرے شہر کی جانب بڑھتا، اور مسلمانوں کی جان وآبرو کے لئے خطرہ بنتا جا رہا تھا، کم سے کم شمالی ہندوستان ہر طرف سے، ایسی طاقتوں کے نرغہ میں تھا، ان طاقتوں اور آمادہ جنگ وپیکار جماعتوں، مسلح تنظیموں کے ظلم وستم اور چیرہ دستی کے واقعات نے، ان احوال کے دیکھنے اور ان سے گزرنے والے افراد کو، قرآن کریم کے الفاظ:

> اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً۔[1]
>
> بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اُس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں کے سرداروں کو بے عزت۔

کی بار بار یاد، تازہ اور چشم دید تصدیق کرائی۔

جب آفات ومصائب کا یہ سیلاب، ہر اک دروازہ تک پہنچنے لگا، دہلی پنجاب اور اس کے اطراف کے علاقے [ہریانہ اور مغربی یوپی وغیرہ] کے اکثر مسلمان اس کا نشانہ بننے لگے، ان کے لئے باہر کے

(۱) سورۃ النمل آیت:۳۴ ترجمہ شیخ الہند

راستے تو غیر محفوظ پہلے سے تھے، اب وہ اپنی بستیوں اور گھروں میں بھی، نشانۂ ستم بننے لگے، اپنے اپنے مفادات ومقاصد حاصل کرنے کے لئے، مسلح گروہ نہتے مسلمانوں پر حملے کرتے، ان کی جانیں ختم کردیتے تھے، سب مال ودولت لوٹ لیتے، علمی ذخیرے اور سامان جلا کر خاک کردیتے، ان کی بے حرمتی کی تمام صورتیں اختیار کرتے، ان کے گھروں کو آگ لگادیتے اور جب دیکھ لیتے، سمجھ لیتے، کہ اب یہاں کچھ نہیں بچا، تو دوسری بستیوں علاقوں کا رخ کر لیتے تھے۔

ان حملوں، کشت وخون کی کثرت، جان ومال اور آبرو کے بے پناہ نقصان کا، مؤرخین نے تفصیل سے تذکرہ کیا ہے،[۱] یہاں ان عبارتوں، حوالوں کے دہرانے کی ضرورت نہیں، مگر ان واقعات واطلاعات کی اسی دور کی، اسی وقت کی تصدیق کے طور پر، دو نادر قلمی خود نوشت دستاویزات، جن کی حیثیت لکھنے والوں کی آپ بیتی اور سرگزشت جیسی ہے، آئندہ صفحات میں شامل کی جارہی ہیں، ان تحریروں سے زیر بحث فتاویٰ کی ضرورت ومعنویت کا زیادہ بہتر اندازہ کیا جاسکے گا۔

ان حوادث کے آنکھوں دیکھے اور خود پر گزرے حالات کی روداد پر مشتمل، دو تاریخی دستاویزات

ہمارے علمی ذخیرہ میں کاندھلہ، کیرانہ، تھانہ بھون کے متعدد افراد کی، ایسی کئی اصل درخواستیں محفوظ ہیں، جو مصیبت زدہ لوگوں نے، مقامی قاضی صاحبان اور حکام کو اپنی بپتا سنانے، اس ظلم کی بے کم وکاست سرگزشت عرض کرنے، اور اپنے نقصانات کی اطلاع، دینے کے لئے لکھی تھیں، ان عرضداشتوں پر مقامی معتبر لوگوں کی گواہیوں اور تصدیقات کے علاوہ، ہر جگہ کے قاضیوں کی مہریں بھی ثبت ہیں۔

یہ دونوں تحریریں [ہمارے وطن، کاندھلہ کی قریب ترین بستی] کیرانہ کے لوگوں پر گزرے حالات کی روداد، اور ان کی بربادی وبے کسی کی کیفیت کی، ایسی معتبر شہادتیں ہیں کہ ان کی تاویل وتردید ممکن نہیں۔

کیرانہ وکاندھلہ [جو موجودہ ضلع شاملی، مظفرنگر] میں شامل جمنا کے مشرقی کنارہ پر واقع مغربی یوپی کی

(۱) عموماً اس دور کی سب ہی تاریخی تصانیف میں اس طائف الملو کی اور باہمی جنگ وجدال کا کثرت سے تذکرہ ہے۔ مختصر معلومات اور ایک جائزہ کے لئے دیکھئے: تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاءاللہ دہلوی ''زوال سلطنت تیموریہ'' دسویں جلد، [سنگ میل پبلشرز۔ لاہور: ۲۰۱۰ء]

آخری سرحدی آبادی کا ایک حصہ ہیں] یہاں کے رہنے والے، ہر قسم کی سیاست اور قصوں سے بے خبر، ہر اک کشمکش سے دور اور پرسکون تھے، ان کو بلا کسی اشتعال کے، کس طرح نشانہ بنایا گیا، ان کے گھر جلائے گئے، قتل و غارت ہوا اور سب کچھ تباہ و تاراج ہو گیا۔

محمد حسن اور مسماۃ رحیماً نے اپنی درخواست میں لکھا ہے کہ ۱۱۷۷ھ [۱۰ر دسمبر ۱۷۶۳ء] کو سکھوں نے اس قصبہ کو چودہ مقامات سے گھیر کر، نشانہ بنا کر، تباہ و برباد کر دیا تھا، مکانات کو آگ لگا دی تھی، جس سے گھروں کا تمام سامان، زمینوں کی ملکیت کے سب کاغذات، شاہی دستاویزات، پروانے وغیرہ جل کر راکھ ہو گئے، کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ تحریر کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

سوال می کند واشہاد حق خود می خواہد، اضعف العباد مسمّٰی محمد حسن و مسماۃ رحیماً، ایمہ دار، پرگنہ کیرانہ، مضاف صوبہ دار الخلافہ، شاہجہاں آباد، از مشایخ عظام و قضات کرام، جملہ خاص و عام، صغیر و کبیر، ساکنان قصبہ مذکور۔

برایں معنی کہ چوں بر ذمہ ہمت ہمایوں حضرت سلاطین، وجہہ کفاف جماعہ فضلاء و علماء وغیرہ مساکین، واجب و لازم، بناءً علیہ حضرت محمد اکبر بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ، مورث من مقران را مستحق الرعایت تصور یدہ، موازی نو دبیگہہ اراضی لاخراجی، بنام حاجی محمد بہ صیغۂ ملک درسواد موضع پنچیٹھ و اکبر پور، عملہ پرگنہ مسطور، بموجب تفصیل ذیل مقرر و معاف کردہ، فرمان عطا فرمودہ بودند۔ چوں واہب و موہوب لہ ودیعت حیات سپردند، والیان مما لک محروسہ و ناظماں محالات ضلع سہارنپور، اراضی مسطور را نسلاً بعد نسلاً و بطناً بعد بطناً بنام ورثہ ہا و متوفی، مسطور بحال و برقرار داشتہ، وتا حال ایں سائلان بر اراضی مرقومہ بلاد.... وتفاوت موہب و متصرف ایم، گاہے از ابتدا و عطا تا الیوم احدے مزاحم و متعرض نشدند، و لغایت ۱۲۱۷ فصلی، محصول اراضی مذکورہ یافتہ آمدہ۔

لیکن در ۱۱۷۷ھ یکہزار و یکصد و ہفتاد و ہفت ہجری، در ہنگامہ سکھان بدکیشان، کہ چہاردہ مقام کردہ قصبہ مسطور را تاخت و تاراج نمودہ، خانہ ہا را آتش دادہ بودند تمامی اسناد و اثاث البیت من مظہران، مع جمیع اسناد و تصاحیح، و پروانجات املاک، بغارت بردند، ہیچ چیز باقی نماند۔

ہر کہ را از برصحت ایں حال وصدق ایں مقال، اگاہی واطلاعے بودہ باشد، حسبۃ للہ گواہی ومہر خود بریں قرطاس ثبت نماید، یا بنوشتن اجازت دہد، کہ عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور گردد۔

درسوادموضع پنجیٹھ عملہ پرگنہ مذکور	درسوادموضع اکبرپورعملہ پرگنہ مذکور
متصرف محمد حسن ومسماۃ رحیمن	بموجب فرمان اکبر بادشاہ
بموجب فرمان اکبر بادشاہ	متصرف حال مسماۃ رحیمن
ستر بیگھہ	بیس بیگھہ

ترجمہ: سوال کرتے ہیں، اپنے معاملات اور حق کی گواہی چاہتے ہیں۔ مسمّٰی محمد حسن اور رحیماً ساکن پرگنہ کیرانہ، صوبہ دارالخلافہ شاہ جہاں آباد۔ تمام شیوخ سے، قاضیان کرام سے اور ہر اک خاص وعام اور اس قصبہ کے رہنے والے، چھوٹے بڑے سے، اس بات پر، چوں کہ علماء فضلاء کی جماعتوں اور ساکنین کی ضروریات اور معاش کا انتظام کرنا، اعلیٰ درجہ کے بادشاہوں پر لازم ہے، اس کی بنیاد پر، اکبر بادشاہ نے میرے بڑوں کو رعایت کا مستحق سمجھ کر، نوے بیگھہ ایسی زمین، جو خراج سرکاری سے مستثنیٰ تھی، حاجی محمد کے نام موضع پنجیٹھ اور اکبر پور میں جو کیرانہ پرگنہ میں ہیں، درج ذیل تفصیل کے مطابق، مقرر اور معاف کی تھی، اس کا فرمان عطا کیا تھا۔ چوں کہ یہ ہبہ کرنے اور لینے والے دونوں نے، زندگی کی امانت سپرد کردی [انتقال کر گئے] تو ان علاقوں کے حاکموں اور ضلع سہارنپور کے [جائیداد کا انتظام کرنے والے] افسران نے، ان زمینوں کو [جن کا ذکر ہوا] نسل در نسل، اولاد در اولاد (حاجی محمد) مذکور کی اولاد کے لئے متعین وباقی رکھا اور قریب کے دنوں تک یہ بغیر کسی اختلاف وپریشانی اس پر قابض اور متصرف تھے، عطائے اراضی کے دن سے، آج تک کبھی کوئی شخص، اس میں مقابل اور رکاوٹ نہیں ہوا، اور ۱۲۱۷ھ فصلی تک، اس کی آمدنی [ہمارے پاس] آتی رہی۔

مگر ۱۱۷۷ھ میں بدطینت سکھوں کے ہنگامہ میں، جنہوں نے قصبہ کیرانہ کو چودہ مقامات سے گھیر کر، قصبہ کو تباہ وبرباد کر کے، گھروں کو آگ دے دی تھی، ہماری تمام دستاویزیں،

کاغذات اور گھر کا سب سامان جل کر خاک ہوگیا، جملہ [شاہی] سندیں، تصحیح نامے بے نام ونشان ہوگئے، کچھ باقی نہ رہا۔

جس شخص کو اس واقعہ کا علم ہو، اس بات کی سچائی سے واقف ہو، یا اس کی اطلاع ہوگئی ہو، وہ اللہ کے لئے اس تحریر پر اپنی گواہی درج کردے، یا اپنی طرف سے [کلمات تصدیق] لکھنے کی اجازت دیدے۔ عنداللہ اجر اور ہم بندوں سے کلمات تشکر پائے۔

اس تحریر کی بارہ لوگوں نے تصدیق کی، اور اس کاغذ پر اپنی گواہیاں، دستخط اور مہریں ثبت کیں۔ ان کے علاوہ قاضیٔ کیرانہ، قاضی رکن الدین کی تصدیقی مہر بھی موجود ہے۔

ایک تحریر اور: اس غارت گری کا واقعہ، ایک اور تحریر میں بھی درج ہے۔ یہ عبداللہ، قطب الدین اور ان کے گھرانہ کی خواتین کی درخواست ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ، ہمارے تمام کاغذات، شاہی فرامین، چک نامے وغیرہ سکھوں کے قصبہ پر حملے اور ظلم وستم میں برباد ہوگئے۔ سکھوں نے دو جمادی الثانی ۱۱۷۷ھ [۱۰/دسمبر ۱۷۶۳ء] کو قصبہ کیرانہ کو تختۂ مشق بنایا تھا، تمام گھر اور ان کا سب تمام سامان تباہ اور جلا کر خاک کر دیا تھا۔ استغاثہ کی عبارت اس طرح ہے، ملاحظہ ہو:

سوال می کند شہادت حق خود ہا میخواہند، اضعف العباد عبداللہ وقطب الدین ومسمات بدھی ومسمات عابدہ، وارثان مسماۃ بہار خاتون مرحوم۔

از سادات عظام ومشائخ کرام وقضات اہل اسلام ومتولیان ذوالاحترام، واہالی وموالی جمہور انام، ساکنون قصبہ کیرانہ، متعلقہ ضلع سہارنپور، مضاف صوبہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد۔

برایں وجہ کی ہمگی وتمامی یکصد وپنجاہ بیگہہ پختہ اراضی لاخراجی، واقع موضع ملک پور عملہ پرگنہ کاندھلہ، بموجب فرمان عالمگیر باسم بہار خاتون، مرقوم ومقررہ بود، تالغایت ۱۱۷۲ فصلی، نسلاً بعد نسلاً، ایں سایلان قابض ومتصرف ماندہ آمدہ۔

چنانچہ فرمان وچک نامہ وغیرہ اسناد، در ہنگامہ سکھان مقہوران، بتاریخ دویم، شہر جمادی الثانی ۱۱۷۷، یکہزار ویک صد وہفت ہجری، قصبہ مذکور را، تاخت وتاراج نمودہ بود، تمام اثاث البیت بغارت رفت وگم گردید چنانچہ در آں ہنگامہ.......................!

[اس دستاویز کا صرف یہی حصہ دستیاب ہوا، دوسرا ورق موجود نہیں]

ترجمہ: سوال کرتے ہیں اور اپنے حق کی گواہی چاہتے ہیں، بندوں میں سے کمزور بندے، عبداللہ اور قطب الدین اور عورتوں میں سے بدھی اور عابدہ، جو بہار خاتون کے وارث ہیں۔

سادات مکرم، مشائخ والا قدر، اہل اسلام کے قاضیوں، لائق احترام متولیوں، چھوٹے بڑوں سے، جو کیرانہ متعلقہ ضلع سہارنپور صوبہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد کے رہنے والے ہوں۔

اس بات پر، کہ کامل ومکمل ایک سو پچاس بیگھہ پختہ زمین، جس پر خراج نہیں تھا، جو ملک پور، پرگنہ کاندھلہ میں، عالم گیر بادشاہ کے حکم کے مطابق، بہار خاتون مذکور کے لئے مقرر تھی، ۱۲۱۷ فصلی تک، نسل درنسل ان سوال کرنے والوں کے قبضہ وتصرف میں، چلی آرہی تھی، مگران کے فرامین، چک نامے وغیرہ، دستاویزات، سکھوں ظالموں کے ہنگامہ میں، بے نام ونشان ہوگئے۔ دو جمادی الثانی ۱۱۷۷ھ کو، جب سکھوں نے اس قصبہ کو تباہ وبرباد کردیا تھا، گھر کا سب سامان ضائع اور لاپتہ ہوگیا۔ چنانچہ اس ہنگامہ میں —— [یہ تحریر نا تمام ہے]

اس تحریر کے پہلے ورق پر، سات لوگوں کی گواہیاں اور مہریں ثبت ہیں، قاضی کیرانہ، قاضی رکن الدین کی تصدیقی تحریر اور مہر بھی موجود ہے۔

مذکورہ اقتباسات اور ان جیسی اور متعدد تحریروں سے، اس وقت کے حالات کی سنگینی کا اچھی طرح علم ہورہا ہے اور ان تحریروں سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے، کہ اس دور میں علمائے کرام نے، ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے جو فتاویٰ تحریر کئے تھے، ان کا سماجی سیاسی پس منظر کیا تھا۔ ان فتاویٰ سے یہ بھی صاف معلوم ہورہا ہے کہ یہ فتوے صرف انگریزوں کی وجہ سے صادر نہیں کئے گے تھے، ان کی اصل وجہ یہ حالات تھے، جن کا اس علاقہ کے لوگوں کی ذاتی تحریرات، نیز ان جیسی اسی مضمون کی اور بہت سی تحریروں میں تذکرہ آیا ہے۔ ایسے میں اس خطہ کو دارالحرب نہ قرار دیا جاتا، تو اور کیا کہا جاتا؟ اس لئے ایسے فتاویٰ کو صرف انگریزوں کے تسلط سے جوڑ کر، پڑھنا دیکھنا صحیح نہیں، بلکہ ان واقعات کی تفہیم کے لئے، ان کے تاریخی،

سماجی معاشرتی اثرات کی تحقیق، جملہ حوادث وواقعات، اور ایسے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

بہرحال، ایسی تمام طاقتیں اور قوتیں، جو مسلم نظام اقتدار سے پنجہ آزما تھیں، مغل حکومت کو کمزور کرنے کے لئے، ان کے نظام کو مسلسل قہر وغضب کا نشانہ بناتی رہتی تھیں۔ ان حملہ آوروں نے مغل حکومت کو جڑوں تک ہلا دینے کے ارادہ سے، شمالی ہند کے مختلف علاقوں، خصوصاً دہلی کے آس پاس کی ایسی تمام بستیوں کو، اپنی چیرہ دستیوں اور خوں آشامی کے لئے، گویا چن لیا اور خاص نشانہ بنالیا تھا، جو مسلمانوں کی دینی علمی تہذیبی رہنمائی کی علامت، ان کی اجتماعیت کا نشان اور علماء وصلحاء اور اہل کمال کا مرکز تھیں، جہاں سے مسلمانوں کو اخلاقی سماجی سبق اور علمی عملی توانائی ملتی تھی، ان پر مسلسل حملے کئے، وہاں کے مسلمانوں خصوصاً ارباب علم وکمال اور خوش حال لوگوں کی عزت وآبرو پامال کی، کتاب خانے جلا کر راکھ کر دیئے، مکانات، حویلیوں بلکہ پوری پوری بستیوں کو آگ میں جھونک کر، ناقابل استعمال کر دیا۔

ان حالات میں، مسلمانوں کے سامنے، اس کے علاوہ کوئی اور صورت اور راستہ نہیں تھا، کہ وہ اپنے ممتاز ومعتمد علمائے کرام کو اپنے حالات سے آگاہ کریں اور ان سے درخواست کریں، کہ وہ ان حالات میں صحیح شرعی رہنمائی فرمائیں، کہ غیر مسلموں کے مسلسل حملوں، لوٹ مار، جان ومال کے بے پناہ نقصانات کے بعد، ان علاقوں کی، دینی شرعی حیثیت کے متعلق کیا فیصلہ ہے؟ کیا اب بھی ان کو دارالاسلام شمار کیا جائے گا، یا ان کی شرعی حیثیت تبدیل ہوگئی ہے۔ اگر حیثیت بدل گئی ہے، تو ان میں عقود فاسدہ کا کیا حکم ہے، سود کے معاملات، غیروں سے لین دین کی ترتیب کیا ہوگی، اور اگر مجبوراً ایسے معاملات سامنے آجائیں، جن کی شرعی کیفیت درست نہیں ہے، ان میں راہ عمل کیا ہونی چاہئے۔ ایسے معاملات وحالات میں، کہاں کس قدر گنجائش ہے، کہاں نہیں ہے۔

اس طرح کے بے شمار سوالات، اس وقت کے ممتاز علمائے کرام اور اہل فتویٰ سے کئے گئے ہوں گے اور ان حضرات نے، حسب موقع وضرورت، ان کے مختصر ومفصل جوابات سے بھی نوازا ہوگا، مگر ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے حوادث وآفات نے، ان تمام ذخیروں کتاب خانوں کو بے نام ونشان کر دیا، جہاں اس طرح کا سرمایہ تحریرات وفتاویٰ ملنے کی امید کی جاسکتی تھی، لیکن اس بڑی تباہی اور غیر معمولی علمی، دینی، ملی نقصان کے باوجود، اللہ کے فضل وکرم سے، سلف کے ایسے دو چار نشانات، چند تحریریں اور فتوے، ہمارے ذخیرہ میں موجود

ہیں۔ یہ تحریریں اور فتاویٰ وہ ہیں، جو برصغیر ہند میں مسلم حکومت یا مغلوں کی، بساط اقتدار الٹ دیئے جانے کے بعد، برصغیر کے مسلمانوں کے لئے، ایک بڑا سہارا اور رہنما ثابت ہوئے تھے۔ اگر چہ حالات کا رخ اب اور ہے، ان مضامین و مسائل پر غور وفکر کرنے کا مزاج نہیں ہے، لیکن ان مسائل کی دینی شرعی، تاریخی، سیاسی، سماجی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس پہلو سے ان کی افادیت واہمیت، ہمیشہ باقی رہے گی، ان پر مختلف زاویوں سے غور وفکر کیا جائے گا ان سے مختلف نتائج اخذ کئے جائیں گے اور ہندی ملت اسلامیہ کے رہنمائی کے سفر اور اس دور کے علمائے کرام کے افکار کی تلاش وتحقیق اور دینی علمی باقیات میں ایسے فتاویٰ کو فراموش کرنا آسان نہ ہوگا۔

اس موضوع کے جو فتاویٰ، سوالات وجوابات دستیاب ہیں، اگر چہ وہ مختلف علاقوں کی نمائندگی وترجمانی کررہے ہیں اور ان کے جوابات تحریر فرمانے والے علمائے کرام کی متفرق خطوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان فتاویٰ میں، حکم شرعی بھی، ایک سے زائد معاملات ومسائل کے لئے، ظاہر کیا گیا ہے، جن میں کامل یکسانیت نہیں پائی جاتی، لیکن اس سب کے باوجود، ان میں ایک قدر مشترک، مسائل ومعاملات کی صاف رہنمائی اور صورت حال کی بہتری اور ممکن ہو تو حالات کو تبدیل کرنے کے لئے، کوشش کے اشارات یکساں کارفرما ہیں۔ تحریک سید احمد شہید ہو یا ۱۸۵۷ء کی میدانی عملی جدوجہد، یا ۱۸۵۷ء کے بعد کی اکثر، سیاسی ملی تحریکات اور بڑی حد تک، دینی نظام کی ترتیب وتشکیل یہ سب گویا ان ہی فتاویٰ کا ایک اثر اور ان ہی کی باقیات الصالحات ہیں۔

یہ ان فتاویٰ اور علماء کی وقت پر بیداری اور مستقبل شناسی کا نتیجہ ہے کہ خصوصاً شمالی ہندوستان میں، مسلمانوں کا دینی ملی کردار، بڑی حد تک محفوظ رہا اور یہ بھی علمائے کرام اور فتاویٰ کی دین تھی، جس نے عام مسلمانوں کو ان جابر قوتوں کے سامنے، ہمت کے ساتھ کھڑا ہونے کا، اور ان سے جرأت مندانہ مقابلہ کا حوصلہ بخشا۔ یہی فتاویٰ تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں کی بڑی اکثریت، معاملات میں، غلط راستوں پر پڑنے سے خاصی محفوظ رہی اور ان ہی فتاویٰ کا ثمرہ ہے کہ برصغیر ہند میں، مسلمانوں نے نہایت عزم وحوصلہ مندی سے، جہاد کی منصوبہ بندی کی، بڑی بڑی معرکہ آرا لڑائیاں لڑیں، تاریخ کے صفحات میں، ایمان واخلاص اور جرأت وجاں سپاری کے، غیر معمولی نشانات چھوڑے، سیاسی تحریکات برپا کیں، اور ملت کو تباہ ہونے اور دوسروں کے لئے لقمۂ تر بننے سے بچالیا اور ان کو صبر وثبات اور استقامت کی تلقین فرمائی۔

ان موضوعات کے فتاویٰ میں سے، بعض فتاویٰ ملک کی شرعی حیثیت، دارالحرب اور دارالاسلام کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں، بعض سے، یہاں کے معاملات کی مشکلات وضروریات کا، فقہی حل معلوم ہوتا ہے اور مستقبل کے لئے اہم فیصلوں میں بھی مدد مل جاتی ہے۔

اس قسم کے فتاویٰ میں، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی[1] [م ۷/شوال ۱۲۳۹ھ۔ ۶/جون ۱۸۲۴ء] کا فتویٰ معروف ہے، جس کو برصغیر ہند کے اس موضوع کے فتاویٰ میں، سب سے پہلا اور اہم ترین فتویٰ کہا جاتا

حضرت شاہ عبدالعزیز اور اس خاندان عالی شان کے، سنین پیدائش اور وفات کی بعض اطلاعات میں غلطی ہوئی ہے۔ صحیح تواریخ پیدائش، وفات کی تحقیق، خصوصا یہاں جو تاریخیں نقل کی گئی ہیں، ان کے مراجع اور تفصیل کے لئے، ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: ''حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد گرامی اور اخلاف کرام'' مجلّہ فکر ونظر اسلام آباد۔ [ستمبر ۱۹۸۷ء]

ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے کہ یہ فتویٰ ۱۸۰۶ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے، قادری صاحب نے اس اطلاع کے لئے کاملان رام پور، احمد علی خاں شوق میں، مولانا عبدالرحمٰن خاں رام پوری کے نام، حضرت شاہ عبدالعزیز کے مکتوب سے استدلال کیا ہے، جو درست نہیں۔ [ملاحظہ ہو: کاملان رام پور ص: ۲۰۳۔ ۲۰۴ مطبوعہ خدابخش لائبریری پٹنہ: ۱۹۸۶ء] ان مکتوبات سے یہ تو معلوم ہو رہا ہے کہ، شاہ صاحب اس خطہ پر کفار کے تسلط اور عمل دخل سے آزردہ خاطر تھے اور جاٹوں مرہٹوں کے غلبہ کو پسند نہیں کرتے تھے، مگر اس سے یہ استدلال کہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیز میں درج، انگریزوں سے معاملات پر فتویٰ بھی اسی وقت لکھا گیا تھا، صحیح نہیں۔

ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ اسی وقت شروع ہو گیا تھا، جب شاہ عالم نے اگست ۱۷۶۵ء میں، بنگال کی دیوانی چھبیس لاکھ روپئے کے عوض، انگریز تاجروں [یا ایسٹ کمپنی] کو بخش دی تھی۔ اس دن کے بعد آنے والا ہر اک نیا دن، انگریزں کے سازشی منصوبوں کے پورا ہونے، برصغیر کے نظام مملکت وحکومت میں، ان کے اثرات بڑھنے اور آہستہ ہر اک بڑی قوی سیاسی طاقت اور مرکز وحکومت واقتدار کے، اس کے سامنے جھکنے، بلکہ سپر انداز ہونے کا تھا۔ مغل بادشاہ، شاہ عالم کی حکومت پر مرہٹوں کا قبضہ تھا اور خود بدولت شہنشاہ نظر بند تھے، یہ زوال اس وقت اپنے نقطہ عروج پر پہنچا، جب جنرل لیک {Lard Lake} نے ایسٹ کمپنی کے ہندوستان میں مقرر کئے ہوئے، جنرل ویلزلی [Marquiss of Wellesley] کی ہدایت کے مطابق، مرہٹہ سردار، مادھوراؤ سندھیا کا شمالی ہندوستان سے قبضہ ختم کرنے کے لئے، بہت بڑی جنگی کارروائی کی، تیاری کر کے شمالی ہند آیا۔ اس کے لئے جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل ویلزلی کو، دکن میں سیاسی اور فوجی اختیارات دیئے گئے تھے، اسی طرح کے اختیارات جنرل لیک کو، شمالی ہندوستان میں دیئے گئے تھے۔ [تاریخ ہند عہد جدید ص: ۲۴۵۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب۔ حیدرآباد: ۱۹۴۸ء]

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

ہے۔ یہ فتویٰ اہل نظر کی توجہ کا مرکز رہا ہے، اس پر خاصا کچھ لکھا جا چکا ہے، یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور جاری رہے گا، لیکن شاہ صاحب کے فتاویٰ کی اہمیت اور حضرت شاہ صاحب کے، عظمت و مقام کے پورے پورے احترام کے ساتھ، یہ عرض کرنے میں کوئی حرج نہیں، کہ شاہ صاحب کے اس معروف فتوے کو اس موضوع کا، سب سے پہلا فتویٰ کہنا صحیح نہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ یہ فتویٰ، دہلی پر انگریزوں کے قبضہ [۱۴/ستمبر ۱۸۰۳ء۔ ۱۷/جمادی الاول ۱۲۱۸ھ کے بعد لکھا گیا تھا، مگر اس کی تاریخ تحریر معلوم نہیں اور ایسا کوئی قرینہ بھی موجود نہیں، جس سے اس کی تعیین کی جا سکے۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا

اس کو بطور خاص یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ:

> ''شمالی ہند میں فرانسیسوں کو جو زبردست اختیارات حاصل ہو گئے ہیں اور وہاں انہیں جو آزادی حاصل ہے، اس کا پورے طور پر خاتمہ کر دیا جائے۔ پورے دوآبہ، یعنی گنگا اور جمنا کے درمیان کمایوں پہاڑ تک، جو علاقہ واقع ہے، بڑا اسلحہ خانہ ہے، اس پر قبضہ کیا جائے۔
> سیاسی تاریخ ہند سر جان مالکم۔ ترجمہ پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ ص: ۲۰۹ جلد اول [دار الترجمہ حیدر آباد: ۱۹۳۲ء]

اس وقت شمالی ہند میں، سندھیا کا سب سے بڑا اسلحہ خانہ اور فوج و رسد کا مرکز علی گڈھ تھا، سندھیا کی فوج کا اعلیٰ کمانڈر، فرانسیسی جنرل، پیرون تھا، جو پہلے سے سندھیا سے بد دل تھا، اس لئے اس نے عین لڑائی کے وقت، سندھیا کی فوج سے استعفیٰ دیدیا تھا، اس کی جگہ پر ایک اور فرانسیسی جنرل، جنرل لوئی بورکین کو کمانڈر مقرر کیا گیا، مگر علی گڈھ کے قریب سندھیا کی فوج، جو فرانسیسی افسران اور جوانوں پر مشتمل تھی، جنرل لیک سے شکست کھا گئی تھی، اسی وقت جنرل لیک کا ۴/ستمبر ۱۸۰۳ء کو علی گڈھ پر قبضہ ہو گیا تھا۔ جنرل لیک اس کے بعد، دہلی کی طرف بڑھا، دہلی کے باہر برطانوی اور فرانسیسی فوجوں میں ایک اور سخت جنگ ہوئی، اس میں بھی جنرل لیک کامیاب ہوا۔ اور ۱۱/ستمبر ۱۸۰۳ء [۲۴/جمادی الاولیٰ، یک شنبہ ۱۲۱۸ھ] کو دہلی پر انگریز قابض ہو گئے اور اسی کے ساتھ ہی اس خطہ سے مغل اور مسلم اقتدار دونوں ساتھ ساتھ، بے دخل اور بے اثر ہو گئے تھے۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے:

(۱) ہند کے حکمراں، فاکوئس ویلزلی۔ تالیف: ڈبلیو، ایچ، ہٹن۔ بی ڈی۔ ترجمہ محمود شوکت دہلوی، ص: ۶۸ [دار الترجمہ عثمانیہ حیدر آباد: ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء]
(۲) سیاسی تاریخ ہند..... تالیف: سر جان میلکم، ترجمہ پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ ص: ۲۴۵، جلد اول۔ [دار الترجمہ عثمانیہ، حیدر آباد: ۱۹۳۲ء]
(۳) تاریخ ہند، عہد جدید۔ تالیف ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب [دار الترجمہ عثمانیہ۔ حیدر آباد۔ ۱۳۶۷ھ۔ ۱۹۴۸ء]

حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتوے کے محرکات اور اس کا زمانۂ تحریر، ایک الگ بحث ہے، یہاں اس پر گفتگو کا موقع نہیں، مگر یہ واضح ہے کہ یہ اس موضوع کا واحد اور پیشرو فتویٰ نہیں تھا، ان موضوعات پر شاہ صاحب کے فتوے سے پہلے اور اس کے بعد بہت سے فتوے لکھے گئے۔ منجملہ ان فتاویٰ میں سے ہمارے ذخیرہ میں چار، نادر و غیر مطبوعہ فتوے اور ایک تحریر محفوظ ہے۔ فتاویٰ میں اہم ترین فتویٰ، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی [م: ۱۲۲۵ھ، ۱۸۱۰ء] کا ہے، جو خود حضرت قاضی صاحب کے قلم سے ہے، اس پر قاضی صاحب کی مہر بھی ثبت ہے، ایک اور فتویٰ، جو اپنی معنویت میں دوسرے فتاویٰ سے کم نہیں، حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی [م: ۱۲۳۳ھ۔ ۹/ اگست ۱۸۱۸ء] کا ہے، یہ فتویٰ شاہ صاحب کی حیات میں نقل کیا گیا تھا، ایک مفصل فتویٰ اور ہے، مگر اس پر، فتویٰ تحریر کرنے والے عالم کا نام درج نہیں۔ ایک اور فتویٰ، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی [وفات: ۱۲۴۵ھ۔ ۱۸۲۹ء] کا ہے، اس میں مفتی صاحب نے حضرت شاہ رفیع الدین کے اس فتوے کی حالات کے مطابقت سے اختلاف کیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اور تحریر [فتویٰ نہیں!] مولانا مفتی شرف الدین احمد رام پوری [م: ۱۲٦۸ھ۔ ۱۸۵۲ء] کی ہے، جس میں مولانا نے اس وقت کے حالات میں [شمالی ہندوستان میں] جہاد کے جواز اور عدم جواز پر گفتگو فرمائی ہے! ان میں سے پہلے دونوں فتوے اور شاہ رفیع الدین کے فتوے پر مفتی الٰہی بخش کا استدراک، آئندہ صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔

فتویٰ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی:[1] ہندوستان کے دارالحرب کے فیصلوں اور فتاویٰ کی فہرست میں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ فتویٰ، اس وقت تک اس موضوع کے معلوم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ، تمام فتووں میں سب سے پرانا معلوم ہوتا ہے۔ اس فتوے میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تمام ملک کے مالک، حربی [غیر مسلم] ہوگئے ہیں، ملک کا انتظام و انصرام، تمام تر ان ہی کے ہاتھ میں ہے، ان کا حکم چلتا ہے،

(۱) **قاضی محمد ثناء اللہ** بن مولوی حبیب اللہ، بن مولوی ہدایت اللہ عثمانی، پانی پتی۔ سنہ پیدائش معلوم نہیں، اندازاً ۱۱۴۰ھ کے قریب ولادت ہوئی ہوگی، تعلیم کی تفصیل اور استادوں کے نام بھی دریافت نہیں، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ سے، قاضی صاحب کے، تعلیم و تلمذ کی مشہور عام روایت، صحیح نہیں، اس کا کوئی معتبر حوالہ اور ثبوت نہیں ملا۔ سلوک و معرفت میں شیخ عابد سنامی (متوفی ۱۱۹۵ھ) سے استفادہ کیا، پھر شیخ کے فرمان کے مطابق، حضرت مرزا مظہر جانجاناں (متوفی ۱۱۹۵ھ) سے وابستہ ہوئے۔

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

انہوں نے قاعدہ جاری کیا ہے کہ جو مسلمان بھی، اپنے سامان معاش، ملکیت زمین، یومیہ سرکاری وظیفہ

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا

حضرت مرزا صاحب کو قاضی ثناء اللہ سے بیحد انس اور مناسبت تھی، علم الہدیٰ کے لقب سے یاد کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''اگر خدا بروز قیامت از بندہ پرسید کہ در درگاہ ما چہ تحفہ آوردی، عرض کنم ثناء اللہ پانی پتی را'' اگر حق تعالیٰ قیامت کے دن دریافت کریں گے کہ ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو، تو میں عرض کروں گا، ثناء اللہ کو [بطور تحفہ لایا ہوں]

قاضی ثناء اللہ کا ستاسی سال کی عمر میں، رجب ۱۲۲۵ھ [۱۸۱۰ء] میں پانی پت میں انتقال ہوا، شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی (متوفی ۸۵۲ھ) کے مزار کے قریب دفن کئے گئے۔

قاضی صاحب کی سینتیس تالیفات کا علم ہے، [اکتیس کے قلمی یا مطبوعہ نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔] قاضی صاحب کی مشہور تالیف، حقوق الاسلام کا مؤلف کا تصحیح کیا ہوا قلمی نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ قاضی صاحب کی تالیفات میں سے، حدیث مظہری، تفسیر مظہری، ماخذ الاقویٰ (فقہ میں) اور فتاویٰ مظہریہ امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ تفسیر مظہری کے اردو میں کم سے کم تین جزوی ترجمے ہوئے ہیں، پوری کتاب کا مکمل ترجمہ، مولانا عبدالدائم جلالی رام پوری، دہلوی کی یادگار ہے۔

مزید معلومات کے لئے دیکھئے: مقامات مظہری از شاہ غلام علی ص:۷۵ تا ۷۸ [مطبع احمدی دہلی: ۱۲۶۹ھ] خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری ص:۹۰-۶۸۹، ج۱، [لاہور ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء] **الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی** ص:۶۷ ج۱، حسن محمد بن یحییٰ ترھٹی [دیوبند ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء] نزہۃ الخواطر ص:۱۱۳ و ۱۱۴، ج۷، [۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء] حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ، مولانا محمد حسین نقشبندی۔ ص:۳۰۳-۳۰۴، [ملک فضل الدین لاہور طبع دوم]

قاضی صاحب کے احوال و تصانیف پر، گذشتہ چوبیس پچیس سال میں، کئی قابل توجہ علمی کام ہوئے ہیں:

(۱) مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی نے، تفسیر مظہری پر، جامعۃ الامام محمد بن سعود، ریاض سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ یہ مقالہ ابھی شائع نہیں ہوا مگر فاضل مرتب کی عنایت سے راقم نے اس کی زیارت کی ہے۔ چھپے گا تو چھ سات سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔

(۲) ایک اور ہندوستانی فاضل نے، تفسیر مظہری پر جامعہ ازہر سے بھی پی ایچ ڈی کی ہے۔ تفصیلات معلوم نہیں۔

(۳) تذکرہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی تالیف ڈاکٹر محمود الحسن عارف [لاہور ۱۹۹۵ء] یہ عارف صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، سوا چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اس میں قاضی صاحب کی خدمات اور تصانیف کا اچھا تذکرہ آ گیا ہے۔

(۴) قاضی صاحب کی ایک بہت اہم یادگار، ''مآخذ الاقویٰ'' کو معدوم و مفقود سمجھا جاتا تھا مگر مجھے اس کا نسخۂ مصنف اور اس کی ایک صاف نقل مل گئی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اسی سال، اس پر تخریج و تعلیق کا کام شروع ہو جائے گا۔ [نور]

اور مقامی ٹیکس کی، وصول یابی جاری رکھنا چاہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قسم کھا کر، متعلقہ ذمہ داروں، حکام کے سامنے، اس کا اعلان واعتراف کرے، کہ میں پرانے وقتوں سے، اس زمین کا مالک ہوں، یا میں یہ یومیہ رقم [روزینہ] اور مال گزاری، لمبے عرصہ سے حاصل کررہا ہوں۔ سوال کرنے والے نے یہ معلوم کیا ہے کہ، ان حالات میں جب ملک کافروں کا محکوم [دارالحرب] ہوگیا ہے، اور اس میں آمدنی کے ذرائع بہت ہی کم ہوگئے ہیں، تو ایسے معاملات میں قسم کھا کر، مالی فائدہ حاصل کرلینا، شرعاً کس حد تک درست ہے۔

حضرت قاضی صاحب کے جواب سے، جو پہلی اہم بات معلوم ہورہی ہے، وہ یہ ہے کہ قاضی صاحب نے دہلی اور اس کے نواحی علاقوں [جس میں آج کل کا، مغربی یوپی ہریانہ اور پنجاب شامل تھے] کو، غیر مسلم حاکموں کے تسلط اور نظام حکومت کی وجہ سے، دارالحرب کا حکم اور حیثیت دی ہے۔ تاہم اس میں، قاضی صاحب نے یہ وضاحت کی ہے، کہ جب مسلمان اس درجہ میں آجائیں کہ، وہ غیر مسلموں کے پوری طرح محکوم اور پابند ہوجائیں، تب بھی ان کو حربیوں کا مال بلا عذر اور معقول وجہ کے کھانا، اپنے استعمال میں لے لینا، جائز نہیں۔ اور اس کا بھی اشارہ کردیا ہے کہ ایسے حالات میں، عقود فاسدہ [غیر شرعی لین دین] کی کس قدر اجازت اور گنجائش ہے۔

تعارف فتویٰ قاضی صاحب: قاضی صاحب کا یہ فتویٰ ۲۵/سینٹی میٹر [۱۰۔انچ] لمبے اور ۱۰/سینٹی میٹر [۴۔انچ] چوڑے کاغذ پر لکھا ہوا ہے، مگر اس کاغذ کی سب سے اوپر کی ایک سطر، یا ایک سطر کے برابر کاغذ ضائع ہوچکا ہے، یہ اسی وقت سے غائب ہے، جب سے یہ کاغذ میرے والد ماجد مدظلہم کی ملکیت میں آیا تھا، اس وقت تک یہ کاغذ جیسا کہ عام طریقہ ہے، موڑ کر اور کاغذات کے ساتھ رکھا ہوا تھا، اسی میں اس کا ایک کونہ چوہوں نے کتر دیا تھا، اوپر سے نیچے تک پورا کاغذ یا فتویٰ، اس ظالم کے دانتوں کا شکار بن گیا۔ اس طرح اس چھوٹے سے کاغذ میں چھوٹی انگلی کے ناخون کے برابر سات سوراخ ہوگئے ہیں، ان پر جو الفاظ درج تھے، وہ بھی دو تین جگہ سے ضائع اور معدوم ہوگئے، مگر شکر ہے کہ اس کی وجہ سے فتویٰ کی، مجموعی عبارت اور بنیادی پیغام متاثر نہیں ہوا۔ نقل میں ایسے سب موقعوں پر نقطے لگادیئے ہیں، جواب کے صرف دو مختصر فقرے یا کلمات ایسے ہیں، جو اگرچہ اصل فتوے سے ضائع ہوچکے ہیں مگر اس کی ایک معتبر نقل میں،

جوا۱۳۷۱ھ[۵۲-۱۹۵۱ء] کی تحریر یادگار ہے، یہ کلمات موجود ہیں، اصل تحریر بھی اس کا اشارہ دے رہی ہے، اس لئے ان کلمات والفاظ کو قوسین [ ] میں درج کر کے، فتوے کا متن مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔

فتوے کا سوال صرف آٹھ سطور پر مشتمل ہے، سوال کرنے والے کا نام معلوم نہیں، لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے، یہ تحریر اور سوال، مولانا ابوالحسن[۱] (خلف حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی) کے قلم سے

---

(۱) مولانا ابوالحسن حسن خلف مفتی الٰہی بخش صدیقی کاندھلوی والد ماجد سے تعلیم حاصل کی، علم فرائض اور طب میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ گوشہ نشین، تارک الدنیا بزرگ تھے، درس وتدریس کا مشغلہ رہتا تھا۔ شعر وسخن کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، مولانا کا کلام سادہ مگر پرتاثیر ہے، حقائق ومعارف میں کئی مثنویاں یادگار ہیں، جس میں گلزار ابراہیم بہت مشہور ہے۔ گلزار ابراہیم اور اس کا دفتر اول مثنوی بحر الحقیقت کے نام سے مؤلف کی حیات میں پہلی بار طبع ہوا تھا، اس کے بعد سے آج تک برابر چھپ رہا ہے، خصوصاً گلزار ابراہیم کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ اردو کی کم کتابوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مولانا عبدالحی حسنی نے لکھا ہے:

لہ مزدوجات مشهورة بالهندية في الحقائق والمعارف على نهج المثنوي والمعنوي (نزہۃ الخواطر ص:۱۰۔ ج:۷)

مولانا کی مثنویوں میں محبت خداوندی کو جوش میں لانے کی بڑی صلاحیت ہے۔

دوسری تالیفات میں مثنوی جدوجہد، مثنوی سمجھ بوجھ، منبع فیض العلوم [منظوم اردو ترجمہ مثنوی مولانا روم شامل ہیں] یہ ترجمہ مثنوی بھی ایک بار طبع ہو چکا ہے، طب میں بحران کے موضوع پر فارسی میں ایک رسالہ اور عربی میں میراث کے مسائل پر حل الغوامض کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی تھی جس میں میراث کے موضوع پر، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے ایک فتوے کی مدلل تحقیق وتردید کی گئی تھی۔

اپنا کلام بھی مرتب کیا تھا، اردو فارسی کلام کے مجموعے بھی خاندان میں موجود تھے۔

مولانا حسن کو حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے گہری وابستگی تھی، مولانا نے سید صاحب کی شان میں متعدد قصیدے کہے اور ایک رسالہ جہادیہ بھی لکھا۔ سید صاحب کی حج سے واپسی پر بھی ایک طویل قصیدہ پیش کیا تھا، اس کے کچھ اشعار منشی محمد جعفر تھانیسری نے [سوانح احمدی ص:۶۶-۶۹ بلالی پریس ساڈھورہ میں] اور غلام رسول مہر صاحب نے [سید احمد شہید ص:۲۴۲-۲۴۳۔ جلد اول لاہور میں] نقل کئے ہیں، مولانا حسن کی بیاض میں یہ مکمل قصیدہ، مولانا کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے گلشن بے خار میں، سعادت خاں ناصر نے خوش معرکہ زیبا میں اور میر محمد خاں سرور نے عمدہ منتخبہ میں، مولانا حسن کا ذکر کیا ہے اور بھی متعدد تذکرہ نگاروں کے یہاں، مولانا کا تذکرہ ملتا ہے۔

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

ہے، قاضی صاحب نے اسی کاغذ پر جواب لکھ دیا ہے۔ جواب تیرہ سطروں پر مبنی ہے، جیسا کہ ذکر ہوا، اس کی پہلی سطر کا کچھ حصہ ضائع ہوگیا ہے، کچھ موجود ہے، کاغذ کی پشت پر بھی جواب کی ایک سطر تحریر ہے، اس کے بعد، اسی دوسرے صفحہ پر قاضی صاحب کی مہر ثبت ہے۔

متن فتویٰ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی

سوال:..الی یوم الدین۔

درصورتے کہ مالک ملک اسلام، حربی شدند، جمیع امورات نظم ونسق ملک، بدست اوشانست، ووجوہ معیشت اہل اسلام، مثل ملک وباج ویومیہ کہ بود، می گویند کہ ازروئے قسم قرآن بگیرند، وبریں معنی قسم خورید، کہ تایوم عمل، مایان سابق برآں وظیفہ قائم بودیم، وقابض ماندیم۔ پس اگر دریں صورت[قسم خوردہ] ملک یایومیہ قابض باشد، مال دارالحرب نسبت فقدان وجوہ معیشت، قسم خوردہ گرفتن، وودرامورات شرعیہ صرف نمودن، جائز است، یانہ! بینوا توجروا.

جواب

کفار کہ بریں ملک مسلط شدہ اند، مسلماناں ایں دیار، حکم مستامنان دارالحرب دارند۔ مسلمان مستامنان کہ دردارالحرب باشند، آنہارا گرفتن مال حربیاں بغدر جائز نیست، اگر بطریق ربا، یا بطریق قمار ومانند آں، اگر گرفتہ باشند، مضائقہ ....است،

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ

حاجی امداداللہ مہاجر مکی متوفی ۱۳۱۷ھ مولانا ہدایت اللہ فارسی سورتی متوفی ۱۳۳۵ھ وغیرہ علماء مولانا کے شاگردوں میں تھے۔ ۲۱؍جمادی الاخریٰ ۱۲۶۹ھ، [۲؍مارچ ۱۸۵۳ء] کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔

مزید معلومات کے لئے: سفینہ رحمانی ص:۸۴۔ تذکرہ مفتی الٰہی بخش، مشمولہ خاتمہ مثنوی مثنوی مولانا روم [محمود المطابع، کانپور] ص:۸۲۔ نزہۃ الخواطر ص:۱۰۔ ج ۷۔ مشائخ کاندھلہ ص:۱۳۴-۱۴۴۔ نیز راقم سطور نورالحسن راشد کاندھلوی کا مضمون، مشمولہ ضمیمہ امدادالمشتاق [احوال وواقعات، حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی] مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب [دہلی: ۱۹۸۱ء]

وبسرقہ وخیانت کہ مقتضائے عذر است، گرفتن جائز نیست، عاصی میشود، لیکن خوردن مال حلال است، با کراہت۔ قال في الهداية:

''إنه حصل بسبب الغدر فاوجب ذالك خبثاً فيه، فيؤمر بالتصدق به''[1]

ومالِ خراج اہل استحقاق را، بقدر استحقاق خوردن جائز ست، لیکن قسم [دروغ خورد]ن برامر ماضی گناہ کبیرہ است۔ اگر ایں قسم قَسَم در پیش آید، بحیلہ وتوریہ می تواں خورد۔ چنانچہ اگر کسے بروظیفہ قائم باشد وچندروز نیافتہ باشد، بگوید کہ ایں وظیفہ سابق.....وایں چنیں نہ گوید، کہ گاہے موقوف نماندہ۔

ترجمہ فتویٰ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ

سوال: اس صورت میں کہ مملکت اسلام کے مالک حربی ہوگئے ہیں، ملک کے تمام معاملات، انتظام اور ملک کی ترتیب ان کے ہاتھوں میں ہے، اور مسلمانوں کے ذرائع آمدنی، جیسے ملکیت زمین اور روزانہ کی آمدنی کے لئے، جو سرکاری رقم مقرر تھی، اس کو [جاری اور] ادا کرنے کے لئے کہتے ہیں، کہ قرآن مجید کی قسم کھائیں اور اس پر بھی قسم کھائیں کہ ہم بہت لمبے عرصہ [پرانے وقتوں] سے آج تک، یہ وظیفہ اسی طرح متواتر و مسلسل پا رہے ہیں اور اس پر قابض ہیں۔

پس اگر اس صورت میں قسم کھا کر، ملکیت یا یومیہ [مقررہ رقم] پر قابض ہو [یہ فرمائیے!] کہ دارالحرب کے مال کو، ذرائع معاش کے، ناپید ہونے کی صورت میں، قسم کھا کر لے لینا اور شرعی [دینی] کاموں میں، خرچ کرنا جائز ہے، یا نہیں۔ بیان فرمائیے، اجر پائیے!۔[2]

(۱) هدايه. كتاب السير، باب المستأمن. ص: ٥٦٤ ج ١. [مطبع مصطفائی لکھنؤ: ۱۲۹۸ھ]

(۲) مغلوں کے دور میں علماء مشائخ قاضیوں اور امورِ خیر کرنے والوں کے تعاون اور عزت افزائی کا ایک طریقہ یہ تھا کہ مختلف بڑی سرکاری جائیدادوں میں، ان کے لئے ایک رقم، جو روپیوں سے چند آنے تک ہو سکتی تھی، مدد کے طور پر، شاہی فرمان کی ہدایت کے مطابق ماہانہ روزانہ متعلقہ شخص کو ادا یا عطیہ کی جاتی تھی، جس سے ان لوگوں کو بہت سہارا مل جاتا تھا، اس کو یومیہ کہتے تھے۔

جواب: کافر کہ جو اس ملک پر مسلط ہو گئے ہیں [اس کی وجہ سے] اس علاقہ کے مسلمان، مستامنان دارالحرب کا حکم رکھتے ہیں اور وہ مسلمان جو مستامنان دارالحرب میں سے ہوں، ان کو حربیوں کا مال، کسی بہانہ سے لے لینا، جائز نہیں، [ہاں!] اگر سودیا جوئے، یا اس جیسے کسی ذریعہ لے لیا جائے، تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن چوری اور خیانت سے، جو فریب اور دغابازی ہے، اس کا لینا جائز نہیں ہے، گنہگار ہوگا۔ اس مال کا کھانا جائز مگر مکروہ ہے۔ ہدایہ میں کہا ہے:

ترجمہ: کیوں کہ یہ مال بدعہدی سے حاصل کیا گیا ہے، اس لئے اس میں ایک گندگی پیدا ہو گئی ہے، اس وجہ سے اس مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

سرکاری ٹیکس کا روپیہ، مستحق لوگوں کو، اپنے حق کے برابر کھانا جائز ہے، لیکن گزری ہوئی بات [ثابت کرنے] کے لئے، جھوٹی قسم کھانا، گناہ کبیرہ ہے، اگر اس طرح کی قسم کھانے کی ضرورت ہو جائے، تو کسی حیلہ اور توریہ کے ساتھ، قسم کھانا چاہئے۔

جیسے اگر کسی شخص کا وظیفہ جاری ہوا اور اس کو کچھ دنوں تک نہ ملا ہو، تو یوں کہے، کہ یہ [میرا] پرانا وظیفہ ہے، [جو نہیں ملا تھا] یوں نہ کہے، کہ یہ کبھی بند نہیں ہوا۔

محمد ثناء اللہ
۱۲۱۷ھ

قاضی صاحب کا اسی موضوع کا ایک اور فتویٰ: قاضی صاحب نے اس جیسے ایک اور سوال کے جواب میں بھی، یہی لکھا ہے، کہ ایسے حالات میں مسلمانوں کو، غیر مسلموں کا مال، ان کی اجازت و رضامندی کے بغیر، لینا جائز نہیں ہے۔

یہ دوسرا فتویٰ، حضرت قاضی صاحب کی ایک نادر تالیف، میں نقل ہے، جس کا نام معلوم نہیں، میرا خیال ہے کہ یہ قاضی صاحب کی اہم علمی یادگار ''مـــا آخـــذُ الأقـــویٰ'' ہے جس کو معدوم و ناپید سمجھا جاتا ہے۔ میرے سامنے موجود نسخہ خود قاضی صاحب کے قلم کا ہے، جس میں قاضی صاحب کے فرزندان، مولانا قاضی محمد صفوۃ اللہ کے بھی ایک سے زائد موقعوں پر، دستخط ہیں۔ قاضی صفوۃ اللہ نے اس

میں، کئی جگہوں پر، قاضی ثناء اللہ کے افادات یا فتاویٰ کا اضافہ کیا ہے۔اسی میں یہ فتویٰ بھی شامل ہے۔اسی فتوے کے اختتام پر قاضی صفوۃ اللہ نے تحریر کیا ہے:

''کتبہ، مولوی صاحب وقبلہ، مولوی محمد ثناء اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ''

یہ نادر فتویٰ بھی ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

سوال: از مال کفار ایں دیار، اگر مسلمانے بہ غصب یا بسرقہ چیزے گیرد، روا باشد، یا نہ؟

جواب: مسلماناں کہ دریں دیار سکونت دارند ودر امان ہستند، وکفار متعرض جان ومال آنہا، نیستند، حکم مستاجر دارند۔ آنہارا گرفتن مال شان بے رضامندی شاں، بہ غصب بُردن، ویا سرقہ نمودن، ومانند آں جائز نیست، کہ مستلزم بہ حدست، چوں آنہا متعرض جان ومال ما نیستند۔ **فنحن احق به بمكارم الاخلاق منهم.**

لیکن دیگر مسلماناں، کہ از دیار تسلط آنہا خارج اند، اگر دریں دیار، بے عقد امان این ہا، مال شان بغصب یا سرقہ ببرید، آنہارا گرفتن مضائقہ ندارد، وحالتِ آں را، ازیں جا دریافت باید کرد، کہ اگر مسلمانے بطریق قرض از کافرے چیزے بگیرد، بروے ادائیگی قرض واجب است، تا غدر لازم نیاید، واگر قصد ادائے قرض دارد، لیکن اورا میسر نشد ومُرد، معذور است، آثم نشود۔[1]

ترجمہ: اس علاقہ کے غیر مسلموں کے مال میں سے اگر کوئی مسلمان غصب سے یا چوری سے کوئی چیز لے لے، یہ جائز ہوگا، یا نہیں؟

جواب: وہ مسلمان جو اسی علاقہ میں مستقل رہتے ہیں، وہ امان میں ہیں، غیر مسلم اس کے جان اور مال کی فکر میں نہیں ہیں، یہ مستاجر کا حکم رکھتے ہیں، ان کو، ان [غیر مسلموں] کا مال

(۱) تالیف: حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، بخط مؤلف ص:۱۲۲ اس نسخہ پر اس کتاب کا نام کہیں نہیں ملا، مگر میرا خیال ہے، کہ یہ قاضی صاحب کی نہایت نادر (جس کو معدوم ومفقود سمجھا جاتا ہے) تصنیف: ''مآخذ الاقویٰ'' ہے۔اس نسخہ پر سلسلہ وار اوراق یا صفحات کا شمار موجود نہیں۔ ہر اک فقہی باب، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، معاملات وغیرہ کے لئے اوراق کا علیحدہ شمار نمبر تھا، پوری کتاب پر مسلسل ورق یا صفحات کا اندراج نہیں، اس لئے راقم نے اس پورے مجموعہ پر ترتیب وار صفحات درج کرا لئے ہیں۔ یہاں صفحات کی ترتیب، اسی نئے شمار کے مطابق ہے، اصل کتاب کے ورق نمبر سے تلاش کرنا، نسبتاً دیر طلب اور مشکل عمل ہے۔

ان کی اجازت کے بغیر، غصب کر کے، لے لینا، یا چوری کرنا اور اس جیسا کوئی اور [کام] کرنا، جائز نہیں ہے [یہ کام] حد [شرعی] لازم کرنے والا ہے، کیوں کہ وہ لوگ [غیر مسلم] ہمارے جان و مال کے درپے نہیں ہیں اور ہم ان کے ساتھ اچھے اخلاق برتنے کے، ان سے زیادہ مستحق ہیں۔

مگر دوسرے مسلمان، جو ان کے زیر اقتدار علاقوں سے خارج ہیں [وہاں کے رہنے والے نہیں ہیں] اگر ان علاقوں میں، ان سے امان کے معاہدوں کے بغیر، ان کا مال غصب یا چوری سے لے جائیں، ان کے لئے اس مال کے لینے میں حرج نہیں ہے۔ اور [ایسے لوگوں اور معاملات کی بات] اس سے سمجھنا چاہئے کہ، اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سے کوئی چیز قرض کے طور پر لے، اس پر اس قرض کا ادا کرنا واجب ہے، تا کہ فریب اور بد معاملگی نہ ہو، اور اگر قرض ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن اس کو (قرض ادا کرنے کے لئے رقم) میسر نہیں، اسی میں مر گیا، تو وہ معذور ہے، گنہ گار نہ ہوگا۔

کتبہ مولوی صاحب۔ قبلہ مولوی محمد ثناء اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ

ایک فتویٰ اور: مفتی الٰہی بخش کی ایک بیاض[1] میں، اِس ملک کی [اُس وقت کی] شرعی حیثیت کے حوالہ سے جو فتوے؟ اور ایک تحریر نقل ہے، ان میں سب سے پہلے ایک مفصل فتویٰ نقل ہوا ہے، اس میں دریافت کیا گیا ہے کہ:

''ما قولہم! ملک متعلقہ دہلی، باستیلاء مرہٹہ یا فرنگ وسکھاں، دار الحرب شدہ، یا نے''؟

آپ [علمائے کرام اور اہل فتویٰ] کیا فرماتے ہیں، کہ یہ ملک جو دہلی سے متعلق ہے، مرہٹوں، انگریزوں اور سکھوں کے تسلط کی وجہ سے، دار الحرب ہو گیا ہے، یا نہیں؟

(۱) مفتی صاحب کی سات آٹھ بیاضیں مختلف موضوعات اور متفرق مباحث و مضامین پر مشتمل ہیں، اس لئے ان کی شناخت اور سہولت کے لئے، ان کے علیحدہ علیحدہ نام تجویز کر رکھے ہیں۔ جس بیاض میں شاہ رفیع الدین کا یہ فتویٰ درج ہے، اس کے لئے بیاض متفرقات [سرخ جلد والی] کا عنوان ہے۔ اس بیاض متفرقات میں، یہ فتویٰ ورق ۳۶، ۳۷ پر آیا ہے۔ ورق ۳۸، الف پر شاہ رفیع الدین کا فتویٰ نقل ہوا ہے۔

یہ تین صفحات پر مشتمل خاصا مفصل فتویٰ ہے، جس میں اس موضوع کی فقہی جزئیات جمع کی گئی ہیں، آخر میں لکھا ہے:

''فیجب علی المسلمین ان یلتمسوا منهم مسلما والمعلوم من حالهم انهم لایضائقون بذالك. وعسی اللّٰه ان یاتي بالفتح اوامر من عنده.''

مگر جیسا کہ تحریر ہوا، اس فتوے پر، صاحب فتویٰ کا نام لکھا ہوا نہیں ہے اور اگر چہ اس فتوے سے فتوی نویس کی، دارالحرب نہ ہونے کی رائے صاف معلوم ہو رہی ہے مگر فتوے کی آخری سطروں سے جھلک رہا ہے، کہ یہ فتوی لکھنے والے بھی، اس دور کے ماحول اور حکومت پر قابض ومسلط افراد سے، گھٹن محسوس کر رہے تھے اور ان حالات سے نجات چاہتے تھے۔

فتویٰ حضرت شاہ رفیع الدین: اس فتویٰ کی نقل کے بعد [مفتی الٰہی بخش کی اس] بیاض کے ایک ورق پر، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک قصیدہ سے، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی میں چند اشعار نقل کئے گئے ہیں، اس کے بعد ورق [۳۸-الف] پر حضرت شاہ رفیع الدین کا فتویٰ ہے، اس فتوے میں بھی ہندوستان کو دارالحرب کہا گیا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے:[1]

''وکتب شیخنا ومولاناالشاہ رفیع الدین ، سلمه اللّٰه الی یوم الدین''

(۱) **حضرت شاہ عبدالوہاب رفیع الدین**، حضرت شاہ ولی اللہ فاروقی دہلوی کے تیسرے یا شاید چوتھے فرزند تھے۔ ۹/ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ [نومبر ۱۷۵۰ء] کو ولادت ہوئی۔ شاہ صاحب کی وفات کے وقت تیرہ سال عمر تھی، شرح جامی وغیرہ درسیات پڑھ رہے تھے، درسیات کی حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد عاشق پھلتی سے تکمیل فرمائی، شاہ محمد عاشق پھلتی سے سلوک ومعرفت میں استفادہ کیا۔

والد ماجد اور برادر گرامی کے علوم وکمالات کے جامع تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کو، اپنے تمام شاگردوں سے فائق شمار کرتے تھے۔ ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز، فارسی ص:۴۰ [طبع اول، میرٹھ: ۱۳۱۴ھ]

شاہ عبدالعزیز نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ، مولوی رفیع الدین فن ریاضی اس قدر جانتے ہیں کہ اس فن کا موجد بھی شاید اسی قدر جانتا ہوگا [ملفوظات فارسی ص:۴۰] یعنی ریاضی میں شاہ رفیع الدین کو ایسا بلند مرتبہ حاصل تھا، جو اس فن کی آخری حد اور منتہائے کمال ہے۔

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

اگرچہ شاہ صاحب کا یہ فتویٰ، مفتی الٰہی بخش کے قلم سے نہیں ہے، غالبًا مفتی صاحب کے کسی شاگرد نے، اس بیاض میں نقل کیا ہے، سوادِ خط سے خیال ہوتا ہے کہ، غالبًا مولانا محمد حسین رامپوری [وفات:.....] کی

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا

شاہ رفیع الدین تمام دینی اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ اوران کے متعلقات کے علاوہ، معقول ومنقول، ادب والٰہیات اور عربی کی تمام اصناف سخن پر یکساں مہارت ودسترس رکھتے تھے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض علوم میں غالبًا حضرت شاہ عبدالعزیز سے بھی آگے تھے۔

شاہ رفیع الدین کی متعدد خود نوشت تحریریں اور فتوے ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ شاہ صاحب کی چھوٹی بڑی بیس سے زائد تصانیف ومؤلفات ہیں، جن میں سے ہر اک اپنے موضوع کی اعلیٰ اور منتخب ترین مصنفات میں شمار کی جاتی ہے، ان میں سے اکثر کتابیں، مولانا صوفی عبدالحمید صاحب نے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے، عمدہ طریقہ پر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

یہاں اس عنایت کا تذکرہ ضروری ہے کہ راقم سطور جب دوسال قبل گوجرانوالہ حاضر ہوا تھا، اس وقت مولانا کے اہل خاندان، خصوصاً مولانا عمار خاں صاحب ناصر زید مجدہ وفضلہ [مدیر الشریعہ] نے مولانا صواتی صاحب کی مرتبہ، حضرت شاہ صاحب کی جملہ کتابیں عنایت فرما کر ممنون فرمایا۔ فجزاہ اللّٰہ خیر الجزاء.

حضرت شاہ رفیع الدین کی ستر سال کی عمر میں، طاعون میں، ۶ رشوال ۱۲۳۳ھ، ۹ راگست ۱۸۱۸ء کو، دہلی میں وفات ہوئی، حضرت شاہ ولی اللہ کے پائیں، منہدیان، دہلی میں دفن کئے گئے۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے:

(۱) حیات ولی: مولوی رحیم بخش دہلوی، ص: ۳۴۰-۳۴۸ [طبع اول، دہلی: شوال ۱۳۱۹ھ]

(۲) ملفوظات شاہ عبدالعزیز، فارسی [طبع اول میرٹھ: ۱۳۱۴ھ]

(۳) یادگار دہلی، سید احمد ولی اللّٰہی۔ [دہلی:]

(۴) نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی حسنی۔ ص:..... ج: ۷ [حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ-۱۹۷۹ء]

(۵) تاریخ وفات: مدفن اور کتبۂ مزار کے لئے، راقم سطور کے مضامین:

الف: حضرت شاہ ولی اللہ کی تاریخ وفات اوران کے اہل خاندان کے مزارات اوران کے کتبے۔ ماہ نامہ برہان دہلی [رمضان ۱۴۰۳ھ جولائی ۱۹۸۳ء ص: ۳۷ تا ۵۰]

ب: حضرت شاہ ولی اللہ اوران کے اجداد گرامی اور اخلاف کرام [راقم نے اس مضمون کا یہی عنوان رکھا تھا، جس کو رسالہ کے مدیر نے تبدیل کر دیا تھا۔

مجلّہ فکر ونظر، اسلام آباد۔ پاکستان [جولائی، ستمبر ۱۹۸۷ء۔ شوال، ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ] ص: ۱۲۲-۱۲۸

تحریر ہے، اگر چہ اس کا قلم کسی قدر باریک ہے، مگر ایک ایک حرف واضح اور صاف ہے۔ یہ فتویٰ فارسی میں ہے۔
افسوس ہے کہ یہ فتویٰ بھی کسی قدر ناقص ہے، اس کے بعض الفاظ پر، جلد ساز نے کاغذ کی پٹی لگادی ہے، جس کی وجہ سے چند الفاظ چھپ گئے ہیں، پڑھے نہیں جاتے۔

شاہ صاحب نے اس فتوے میں تحریر فرمایا ہے، کہ اگر چہ اس ملک کے دارالحرب ہونے [کے حکم] میں اختلاف ہے، لیکن اس میں ترجیح دارالحرب ہونے کو ہے۔ اس کے بعد کسی ملک کے دارالحرب ہونے کی، وجوہات پر مختصر گفتگو فرمائی ہے، اور فیصلہ کیا ہے کہ:

''ایں ہمہ اموراین جا موجود اند، لہٰذا دارالحرب است''

یہ سب معاملات [اور حالات] یہاں موجود ہیں، اس لئے یہ دارالحرب ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے اس فتوے میں کوئی فقہی جزئیہ یا عبارت نقل نہیں کی، صرف اس ملک کے [جو مغلوں کے زیر نگیں تھا] دارالحرب ہوجانے کی وجوہات لکھی ہیں۔ اصل فتویٰ ملاحظہ ہو:

متن فتویٰ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی

وکتب شیخنا ومولانا الشاہ رفیع الدین سلمہ اللہ الی یوم الدین

''بداں کہ [در] دارالحرب شدن ایں ملک اختلافے است، لیکن راجح دریں باب اثبات است، یعنی دارالحرب گشتہ است۔ تفصیلش آں کہ:

بعضے علماء میگویند کہ دارالاسلام ہرگز دارالحرب نمی شود، وبعضے میگویند کہ اگر یک حکم اسلام جاری باشد، مانند اعلان بہ نماز ومانند آں، دارالحرب......قول راجح آنست، کہ دارالاسلام بسہ شرائط دارالحرب میشود:

یکے: آں کہ، مسلمانان قریب الحدود واز استخلاص آں......سعی آں موقوف کنند، خواہ متصل بدارالاسلام باشند، خواہ نہ۔

دوئم: آں کہ، ہیچ کس از مسلمانان آں جا، بر معاش خود متصرف امانِ اول، بے امان ایشاں متصرف نمی تواند شد۔

سویم: آں کہ کفار آں قدر مستولی نشوند کہ ہر چہ از احکام اسلام......می کنند و ہر چہ خواہند باقی گزارند۔ آرے! اگر بابعضے احکام مناقشہ ندارند، تعرض نکنند، جریان آں فائدہ نمی کند....ثانی داخل است کہ رفع خصومات و فیصل آں، بمرضی کفار باشد، نہ برخلاف آں! و جریان بشوکت کفار باشد، نہ بشوکت اسلام......ایں ہمہ امور ایں جا موجود اند، پس دارالحرب است''

ترجمہ فتویٰ

ہمارے شیخ اور رہنما، مولانا شاہ رفیع الدین نے لکھا ہے:

معلوم ہو، کہ اس ملک کے دارالحرب ہونے میں اختلاف ہے، لیکن راجح اثبات کا پہلو ہے، یعنی یہ ملک دارالحرب ہوگیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

بعض علماء کہتے ہیں کہ دارالاسلام کبھی بھی دارالحرب نہیں ہوتا اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر وہاں اسلام کا ایک حکم بھی جاری ہو، جیسے نماز کا اعلان یا اس جیسی کوئی اور اجازت (وہ ملک) دارالحرب [نہ ہوگا]۔

لیکن قول راجح یہ ہے کہ دارالاسلام تین شرطوں کے ساتھ، دارالحرب ہو جاتا ہے۔

ایک: یہ ہے کہ اس کے قریب رہنے والے مسلمانوں نے اس علاقہ کے دارالاسلام بنانے کی کوشش چھوڑ دی ہو، ان کی یہ کوشش ترک کرنا، چاہے دارالاسلام سے قریب نہ ہونے کی وجہ سے ہو، یا اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے۔

دوسرے: یہ ہے کہ وہاں، مسلمانوں میں سے کوئی بھی مسلمان، پہلی امان کے مطابق، محفوظ و مامون نہ ہو۔[1]

تیسرے: یہ ہے کہ وہاں غیر مسلم اس قدر طاقتور اور بااختیار نہ ہو جائیں، کہ اسلام کے احکام میں سے، جس حکم کو چاہیں ختم کر دیں، اور جس حکم کو چاہیں، باقی رکھیں۔ ہاں اگر کچھ اسلامی مسائل و احکامات سے اختلاف و تعارض نہ کریں، تو اس طریقہ کا جاری ہونا فائدہ نہ کرے گا،

(۱) اس کے حاشیہ پر مفتی الٰہی بخش نے مختصر تحریر یا اشارہ لکھا ہے اس کی تحریر بہت ہلکی ہے، کچھ جلد سازی میں حاشیہ کٹ گئی اس لئے سمجھ میں نہیں آیا، اس کے آخر میں لکھا ہے:

ایں شرط کسے نوشتہ یہ شرط کس نے لکھی ہے؟

[یعنی یہ دارالحرب ہی رہے گا] یہ دوسری صورت میں داخل ہے کہ اختلافات کا دور کرنا اور ان کا فیصلہ کرنا، کافروں کی مرضی سے ہو، اس کے خلاف نہ ہو اور سب معاملات کا باقی اور جاری رہنا، کافروں کی قوت ومداخلت سے ہو، مسلمانوں کی شوکت اور اثر سے نہ ہو۔

یہ سب معاملات اور صورتیں یہاں موجود ہیں، اس لئے یہ دارالحرب ہے۔

شاہ رفیع الدین کے فتوے پر مفتی الٰہی بخش[1] کی تعلیق وتنقید: مگر حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کو، اپنے دوست اور رفیق وہم سبق کے اس فتوے سے اتفاق نہیں تھا۔ مفتی صاحب نے اس فتوے کے اپنی بیاض میں اندراج کے بعد، اس پر اپنی رائے بھی لکھی ہے۔ مفتی صاحب نے حالات کا اور طرح سے

(۱) مفتی الٰہی بخش نشاط بن مولانا حکیم شیخ محمد عرف شیخ الاسلام صدیقی کاندھلوی، ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے، والد محترم سے ابتدائی درسیات پڑھیں، پھر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م۱۲۳۹ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہدایۃ النحو سے حدیث کی اعلیٰ ترین کتابوں تک، جملہ معقولات وفنون اور طب کی اعلیٰ درسیات شاہ صاحب سے پڑھیں، اوران میں کمال حاصل کیا۔ شاہ رفیع الدین (م۱۲۳۳ھ) کے ہم درس تھے (نزہۃ الخواطر ص:۲۶۹۔ ج۷) مفتی صاحب، شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ شاہ صاحب فرماتے تھے:

''میرے شاگردوں میں تین آدمی نہایت لائق اور عمدہ ہیں، مولوی رفیع الدین اور مولوی الٰہی بخش...''

تعلیم مکمل کرنے کے بعد نجیب الدولہ (م۱۱۸۴ھ۔۱۷۷۰ء) کے دربار سے بحیثیت مفتی اول وابستہ ہوئے، ضابطہ خاں کی وفات ۱۲۰۰ھ۔۱۷۸۵ء تک، اسی عہدہ پر فائز رہے۔ ضابطہ خاں کی وفات کے بعد، امیر نگر، بریلی، تھانہ بھون، خورجہ، سہارنپور، کوئٹہ (راجستھان) وغیرہ میں درس وتدریس اور دینی خدمات کا سلسلہ جاری رہا، ملازمت بھی کی۔ آخر عمر میں وطن آگئے تھے، یہیں درس وتدریس وعظ وارشاد اصلاح وہدایت اور معالجات ومطب کے علاوہ، تصنیف وتالیف کا عمل جاری رہا۔ مفتی صاحب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، جس میں مرزا حسن علی (صغیر) محدث لکھنوی (م۱۲۵۵ھ) مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی (م۱۲۶۲ھ) اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (م۱۲۹۷ھ]) جیسے ممتاز ترین خادمان دین وسنت، کے نام شامل ہیں۔ مولانا عبدالحی حسنی نے لکھا ہے:

درس وافادہ مدۃ عمر وأخذ عنہ خلق لایحصون بحد وعد.

زندگی بھر درس وتدریس میں مشغول رہے، اوران سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔

(الثقافة الاسلامیہ فی الھند ص: ۳۱۱. المجمع العلمی دمشق: ۱۳۷۷ھ۔ ۱۹۵۸ء)

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

مطالعہ وتجزیہ کیا ہے، حضرت قاضی صاحب اور شاہ صاحب، دونوں نے اپنے فتاویٰ میں مغل حکومت کے زوال اور اس کے نتیجہ میں سرگرم، غیر اسلامی گروہوں قوتوں کے اثر ونفوذ کو، اپنے فتاویٰ کی اساس بنایا ہے۔ مفتی صاحب نے، سیاسی، سماجی حالات سے ہٹ کر، اراضی وجائدادوں پر پرانے قبضوں، ان سے متعلق، مسائل اور اختلافات کے، دینی شرعی فیصلوں اور انتظامی ترتیب پر، اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھی ہے کہ تمام لوگ خصوصاً مسلمان، اپنی اپنی جائدادوں پر قابض ہیں، ان میں ہر طرح سے ترمیم وتصرف کر سکتے ہیں۔

مفتی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ، پرانا نظام قضات بدستور ہے کہ تمام معاملات قاضیوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور شریعت کی روشنی میں ان کے فیصلے صادر کئے جاتے ہیں، یعنی نظام شریعت ایک حد تک موجود اور نافذ ہے، مسلمان اپنے معاملات میں فی الجملہ آزاد ہیں، اس لئے اس ملک کو جو دارالاسلام تھا، دارالحرب نہیں کہا جاسکتا۔ مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ جائدادوں کی خرید وفروخت پر کوئی پابندی نہیں ہے،

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا

حدیث، فقہ، تفسیر، تجوید، تاریخ [تذکرہ وسوانح، رجال وطبقات] عقائد، کلام، منطق، فلسفہ، نحو، صرف، طب، تصوف، ادب، نظم ونثر عربی اردو فارسی نجوم، جفر، رمل وغیرہ موضوعات پر ایک سو پندرہ تصانیف ومؤلفات ترجموں اور شرحوں کا اب تک علم ہوا ہے، امید ہے کہ اور بھی ہوں گی۔ مولانا احتشام الحسن صاحب نے، مشائخ کاندھلہ میں صرف چونتیس تالیفات کا ذکر کیا ہے۔

مفتی الٰہی بخش کی تالیفات میں سے خاتمہ مثنوی مولانا روم، مشہور ہے، جو ۱۲۱۶ھ [۱۸۰۱ء] کی تالیف ہے۔ خاتمہ مثنوی، پہلی مرتبہ ۱۲۸۲ھ۔۱۸۶۶ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپا تھا، اس کے بعد سے ہندوستان میں شائع مثنوی کے ہر اک ایڈیشن کے ساتھ چھپ رہا ہے۔

۱۵ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۵ھ [۱۳ر دسمبر ۱۸۲۹ء] کو کاندھلہ میں وفات ہوئی، کریم الدین پانی پتی نے مفتی صاحب کی وفات ۱۲۵۰ھ میں لکھی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے: **حدیقۃ الإفراح احمد بن محمد یمنی شروانی**، ص: ۴۲۵، ۴۲۸ [کلکتہ ۱۲۲۹ھ] سفینہ رحمانی عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی، ص: ۷۶، ۷۷ [لکھنؤ ۱۸۸۴ء] فرائد الدہر، مولوی کریم الدین پانی پتی، ص: ۳۸۷، [مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۷ء] تذکرہ مفتی الٰہی بخش قلمی، مؤلفہ مولانا محمد سلیمان کاندھلوی، [نسخہ مؤلف] حالات براختتام مثنوی ص: ۷۹-۹۰ [محمود المطابع کانپور ۱۳۱۹ھ] نزہۃ الخواطر ص: ۷۰ ج: ۷ مشائخ کاندھلہ ص: ۵۰-۱۱۲ [اشاعت دینیات دہلی بلا سنہ] مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی، تالیف نور الحسن راشد کاندھلوی۔ [کاندھلہ: ۱۴۲۲ھ۔ ۲۰۰۱ء]

اوراگر کوئی اختلاف ہوجائے، کسی کی جائداد پرکوئی ناجائز قبضہ کرنا،یااس کی حدود میں کچھ ترمیم کرنا چاہے،تو زمین کا مالک،اس کے لئے شاہی فرامین اوردستاویزات کی روشنی میں دعویٰ کرسکتا ہے یہ دعویٰ اسلامی قانون اورطریقۂ شہادت کے مطابق سناجاتا ہے،اسی طرح اس کا فیصلہ صادر کیا جاتا ہے، قضات کے فیصلے مؤثر وکارفرما ہوتے ہوئے،اس ملک کو دارالحرب کیسے کہا جاسکتا ہے۔؟اس تحریراور نقطہ نظر کا مطالعہ بھی،افادیت سے خالی نہیں،اس لئے اس کوبھی پڑھ لیناچاہئے۔مفتی صاحب نے لکھاہے:

قلت: چوں شروط ثلاثہ دردارالکفر شدن قول راجح معتبراست،وآں شروط رادر برہان، وغرائب،وحمادیہ،ودرمختار،وفتاویٰ سراجیہ مفصل نوشتہ است،ومنجملہ آں ایں ست،کہ: ’’**ان لایبقی مسلم اوذمی آمنا بالامان الاول علی نفسہ**‘‘چوں ایں شرط متحقق ست،بلکہ ہمہ سکّان برنفس خود بامان اول امین اند،بلکہ برمعاش خود بموجب اسنادوفرامین سلاطین قابض اند،آرے!اگربا کسے مناقشہ می کنند،بحجت کواغذ معلیٰ،یاباتوفیر کواغذ اراضی معترض میشوند،وقضایا را از قضات اسلام،فیصل می دہانند،ودرعدالت خود بموجب حکم قضات ومفتیان دین محمدی،عمل می نمایند۔وبادشاہ اسلام رااز ملک ہرسال مبلغ میدہند، واطاعت اومی نمایند،وخودرانائب بادشاہ ونوکروفدوی اومی شناسند،اگرچہ محصول ملک تمام نمی دہند،اوتاقتے کہ یابند.......ہم دہند۔بادشاہ اسلام را....... باشند۔

واگراز راہ ظلم عاملے یافوجدارے بکسے،ویابمعیشت تعرض رساند،ازیں قدرامان ہرکس مرتفع نمی شود،وایں کہ تصرف نکند،ایں قاعدہ ہمہ حکام است،برائے تحقیق است،وخلط کردن خالصہ درارض خراجی عمل می آرند،امان اول رانقض نمی کند۔پس تمملک دارالحرب نشدہ است،بہرحال دریں باب حکم بردارالاسلام بدارالحرب شدن،ومقتضی ہمیں است کہ۔۔۔۔جانب اسلام نمایند،چنانکہ ازابراہیم شاہی گذشت۔اخذربا، بربنارواج دربلاد مسلمین نباید،وگناہ برعامۂ مسلمین درتوطن لازم آید۔

ترجمہ: میں[مفتی الٰہی بخش]کہتاہوں چوں کہ[دارالاسلام کے]دارالکفر ہونے میں،

تین شرطوں کا پایا جانا معتبر ہے اور یہ شرائط برہان میں، غرائب میں، فتاوی حمادیہ اور درمختار اور فتاویٰ سراجیہ میں مفصل لکھی ہیں، ان میں سے یہ ہے:

اس میں کوئی مسلمان اور ذمی اپنے کو [مامون اور پرانے بادشاہوں کے دیئے ہوئے امن کے مطابق] محفوظ نہ سمجھے۔

چوں کہ یہ شرط [یہاں] موجود اور متحقق ہے، یہاں کے سب رہنے والے، اپنے جان و مال کے لئے، پہلی روایات کے مطابق محفوظ ہیں، بلکہ اپنی آمدنی کے ذرائع [زمین وغیرہ] پر بادشاہوں کے فرامین اور دوسری دستاویزات [کی وجہ] سے قابض ہیں، بلاشبہ! اگر ان سے کوئی اختلاف [یا جھگڑا] کرے، تو اعلیٰ درجہ کی [شاہی] دستاویزات یا زمین کی ملکیت کے کاغذات [کی مدد] سے، اس پر اعتراض [اور دعویٰ] ہوجاتا ہے۔ اور تمام معاملات واختلافات کا، قاضیان اسلام فیصلہ دیتے ہیں اور اپنی عدالتوں میں، قاضیوں اور دین محمدی کے مفتیوں کے احکامات پر عمل کرتے ہیں۔

اور اس ملک پر قابض لوگ، ہر سال بادشاہ اسلام کو بڑی رقم دیتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں، اور خود کو بادشاہ کا نوکر اور اس کا نیاز مند سمجھتے ہیں۔ اگر چہ یہ لوگ ملک کا تمام محصول بادشاہ کو نہیں دیتے، جب تک کہ اس کو .... پابند نہیں پاتے، لیکن ......بھی دیتے ہیں اور بادشاہ اسلام کو ......ہوں گے، اگر کوئی سرکاری ملازم یا سپاہی ظلم کرتے ہوئے، کسی کے سامان معاش میں مداخلت کرتا ہے۔

اس قدر امن کسی شخص سے بھی ختم نہیں ہوا، اور یہ بھی کہ [کسی شخص کی مملوکہ] جائداد اور ...... پر بلا انتظامی ذمہ داران [پولیس] اور معتبر سرکاری کاغذات کے [قبضہ یا دعویٰ] نہیں کرتے ہیں، یہ ہندوستان کے تمام افسران کا ضابطہ ہے اور یہ تحقیق کے لئے ہے۔ اور خالصہ کی زمین کو، خراجی زمین کی طرح عمل میں لاتے ہیں [مگر یہ کام] امان اول کو ختم نہیں کرتا ہے، اس لئے یہ ملک دارالحرب نہیں ہوا ہے۔

بہر حال اس معاملہ میں، دارالاسلام کے دارالحرب ہونے کا حکم اس کا [حق] اور تقاضہ یہ

ہے کہ اس میں........اطراف کے پہلو کو [نمایاں اور] واضح دکھائیں، جیسا کہ [فتاویٰ] ابراہیم شاہی کے حوالہ سے گزرا ہے۔

مسلمانوں کے علاقوں میں سود لینے کا رواج نہ ہونا چاہئے، اس کا گناہ وہاں رہنے والے مسلمانوں پر آتا ہے۔

اس فتوے کے آخر میں مفتی صاحب نے لکھا ہے، کہ یہ بات ابراہیم شاہی کے حوالہ سے گزر گئی ہے، لیکن مفتی صاحب کی تحریر اور شاہ رفیع الدین کے فتوے، دونوں میں فتاویٰ ابراہیم شاہی کا کچھ تذکرہ نہیں آیا، اس لئے یہاں یہ حوالہ بے محل معلوم ہورہا ہے، ممکن ہے اس وقت کوئی اور تحریر بھی سامنے آئی ہو یا لکھی گئی ہو، جس میں ابراہیم شاہی کا حوالہ ہو۔ دوسرے آخری سطور میں، ربا سود کے مسلم بستیوں میں رواج کی برائی کا تذکرہ ہے، یہ بات اگرچہ اپنی جگہ صحیح اور حق ہے مگر شاہ رفیع الدین کے فتوے میں اس کا بھی کچھ تذکرہ نہیں۔ مفتی صاحب نے بہ ظاہر اس کے ذریعہ سے، دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز یا گنجائش کے، کسی فتوے پر بند لگایا ہے اور اس میں صحیح حکم شرعی بیان کردیا ہے۔

تحریر مولانا مفتی شرف الدین احمد رامپوری: مفتی شرف الدین[1] صاحب کی یہ تحریر مفتی صاحب کی تالیفات کے ایک مجموعہ میں [جس میں رسالہ فی الخصائص النبویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وتحیۃ اور رسالہ تجوید القرآن اور رسالہ اسمائے بدریینؓ شامل ہیں] سب سے پہلے لگا ہوا ہے۔ اس کی

(۱) **مولانا مفتی شرف الدین احمد رامپوری** پنجاب کے رہنے والے، خاندان سادات میں سے تھے، زندگی کا بڑا حصہ رام پور میں گزرا، تفصیلی حالات دریافت نہیں۔ علم وفضل میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، اس دور کے اکثر ممتاز علماء رام پور نے مفتی صاحب سے استفادہ کیا اور تعلیم حاصل کی۔ دو تین تصانیف علمی یادگار ہیں۔ ۱۲۶۸ھ [۱۸۵۲ء] میں انتقال ہوا۔ معلومات کے لئے دیکھئے:

(۱) وقائع عبدالقادر خانی رام پوری، کا ترجمہ علم وعمل [عبدالقادر خاں مفتی شرف الدین کو دیکھنے والوں میں سے تھے۔] ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڈھی۔ حواشی ایوب قادری ص:۷۹-۷۸ جلد اول [کراچی:۱۹۷۰ء]

(۲) تذکرہ کاملان رام پور۔ احمد علی شوق رام پوری ص:......

(۳) نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی حسنی۔ ص:.....ج:۷ [حیدرآباد:۱۳۹۹ء]

ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے:

ماقولهم رحمه الله، در بارہ جہاد فی سبیل اللہ، کہ در کدام حالت، وبکدام شروط۔ وبر کدام کس فرض عین گردد۔ ودر کدام حالت، وبکدامی شروط، بر کدام کس منجملہ فروض کفایہ باشد۔ بینوا توجروا۔

ترجمه: کیا فرماتے ہیں [علمائے کرام] اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔ جہاد کے معاملہ میں کہ جہاد فی سبیل اللہ کن حالات میں، کن شرائط کے ساتھ اور کس شخص پر فرض عین ہوتا ہے اور کس حالت میں، کن شرائط کے ساتھ اور کس شخص پر فرائض کفایہ میں سے ہوگا؟

مفتی شرف الدین احمد کی یہ تحریر بھی مفتی الٰہی بخش صاحب کے قلم سے نہیں ہے، بلکہ اس تحریر کی آخری سطور سے خیال ہوتا ہے کہ یہ خود مفتی شرف الدین احمد کے قلم کی یادگار رہے، لکھا ہے:

الراقم اضعف عباد اللہ الصمد شرف الدین محمد۔ فقط

یہ رسالہ فارسی میں ہے، پانچ صفحات پر مشتمل ہے، تاریخ وسنہ کتابت درج نہیں ہے۔

شیخ الہند کے مقدمۂ ترجمۂ قرآن مجید کے

دو علیحدہ متن، یا دو مطبوعہ نسخے اور ان کے اختلافات

ترجمۂ شیخ الہند کی تالیف میں، شریک عمل علمائے کرام، پہلی طباعت، افادات شیخ الہند کی تکمیل کے لئے کوشش، ان کے مرتبین اور متعلقہ چند معلومات

نور الحسن راشد کاندھلوی

اردو زبان میں قرآن کریم کے جو ترجمے سب سے زیادہ چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن [ولادت:۱۲۶۸ھ، ۱۸۵۱ء۔ وفات:۱۸/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ، ۳/نومبر ۱۹۲۰ء] کا ترجمہ قرآن کریم [موضح فرقان] نیز اسکے افادات اور حاشیے، مرتبہ علامہ شبیر احمد عثمانی [ولادت:تقریبا ۱۳۰۵ھ، وفات:۲۲/صفر ۱۳۶۹ھ، ۱۳/دسمبر ۱۹۴۹ء] کثرت طباعت واستفادہ میں غالباً سب سے بڑھ کر ہیں۔ یہ ترجمہ گذشتہ نوے سال [پہلی طباعت ۱۳۴۴ھ، ۱۹۲۳ء] سے موجودہ دور تک، کتنی مرتبہ چھپا، اس کا حساب بلکہ اندازہ کرنا بھی آسان نہیں، مگر ہمارے یہاں جس طرح اور متعدد بڑی، نہایت مفید اور مقبول عام، علمی دینی خدمات، [قرآن مجید، تفسیر، حدیث وغیرہ کی اہم ترین کتابوں] کے لئے جیسا چل رہا ہے، چلنے دو، ہونے دو، رہنے دو، کی روایت عام ہے۔ بنیادی اصولی فنی متون کی طباعتوں اور انکی درستگی متن کا کچھ اہتمام، یا اس کے لئے دیرپا قابل عمل منصوبہ کی تشکیل، کثرت سے چھپنے اور متواتر مطالعہ واستفادہ میں رہنے والی کتابوں پر، علمی تحقیقی تنقیدی نظر کا، شاید خیال ہی نہیں آتا، بار بار تصحیح اور علمی نظر کا تو معمول ہی ختم ہو گیا، حال آں کہ اہم ترین فنی مراجع بھی، بار بار اہل علم، اہل نظر کی توجہ چاہتے ہیں، کہ ان میں جو غلطی در آئی ہو، جو سہو کتابت ہو گیا ہو اور ایک ہی کتاب کی مختلف مطابع اور اداروں سے متواتر چھپائی کی وجہ سے، ان میں جو تغیر آ گیا ہو، فرو گذاشتیں ہو گئی ہوں، ان کی بروقت تصحیح کا انتظام ہو، قدیم معتبر و معتمد اور صحیح ترین مطبوعہ نسخوں سے ان کا مقابلہ اور اپنی ضرورت کے علاوہ، اپنے شاگردوں، خصوصاً ایسے نئے مدرسین کے لئے [جو درسی کتابوں کی کتابت وطباعت کی کمزوریوں کو نہیں سمجھتے اور ان کی وجہ سے راہ سے بے راہ ہوتے رہتے

ہیں]علمی درسی متون کی تحقیق بلاشبہ نہایت ضروری ہے، لیکن برصغیر کے ایک دو بڑے اداروں یا ناشرین کے علاوہ، جو اپنی تجارتی ضرورتوں سے چند کتابوں کی تصحیح و مقابلہ کے کام پر کچھ توجہ رکھتے ہیں، عموماً ہمارے علمی حلقوں کا اس سے کچھ لینا دینا نہیں، کہ ان کتابوں میں کیا ہورہا ہے، مصنف کے الفاظ کیا تھے، کیا بن گئے ہیں، کون کون سی عبارتیں یا عنوانات، کہاں سے کہاں پہنچ گئے، کہاں سے کس قدر عبارت ساقط ہوگئی، کونسے الفاظ کم ہوگئے ہیں، یا بڑھا دیئے گئے، یہ غلطی کس سے سرزد ہوئی، کسی بھی بات کی تحقیق و تلاش کجا، اس کی طرف ذرا سی توجہ بھی نہیں ہے، حال آں کہ یہ کام تمام دینی تعلیمی اداروں، ملت کے دینی علمی مستقبل کی تعمیر، عالی شان ملی ورثہ کی حفاظت اور اس کو آئندہ نسلوں تک، صحیح حالت میں پہنچانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اگر ہمارے بڑے علمائے کرام اور بڑے دینی تعلیمی ادارے، اس مقصد کے لئے ایک منصوبہ بنا کر، ایک بڑا بجٹ مقرر کر کے، نوجوانوں، ذی استعداد فارغین کو، اس مبارک اور ضروری کام پر لگائیں، تو ان شاءاللہ تعالیٰ علم کا ایک نیا چمنستان آباد ہوسکتا ہے۔

اس قسم کی کتابوں میں ممتاز درسیات و مراجع کے علاوہ، قرآن کریم کے اہم ترین ترجمے اور وہ دینی کتابیں بھی شامل ہوسکتی ہیں، جن سے ہمہ وقت رجوع اور استفادہ کیا جاتا ہے، مگر کثرت طباعت کی وجہ سے ان میں کثیر اغلاط اور تصحیف متن درآئی ہے، لیکن اکثر پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہیں، کہ جو اشاعت ہمارے سامنے ہے، وہ اعتبار و استناد کے لحاظ سے کس درجہ کی ہے، اس پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں، اس کے کسی پہلو کی تحقیق، تصحیح و مراجعت ضروری ہے، یا نہیں۔

ایسی ہی چند قابل توجہ دستاویزی نوعیت اور عام استفادہ کی نہایت ضروری چیزوں میں سے ایک، شیخ الہند، حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے ترجمۂ قرآن کریم ''موضح فرقان'' کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

یہ مقدمہ ترجمۂ شیخ الہند کی پہلی طباعت مدینہ پریس بجنور: ۱۳۴۴ھ [۱۹۲۳ء] سے اس وقت تک، ترجمہ شیخ الہند کی تمام اشاعتوں کے ساتھ شامل ہے [ترجمہ شیخ الہند کی غالباً تین، چار اشاعتیں ایسی بھی ہیں جن میں یہ مقدمہ شامل نہیں] مگر راقم سطور کی معلومات میں آج تک یہ مقدمہ، اس کے علمی فنی گوشے، اس کے اہم مندرجات، کسی فاضل کی توجہ کا محور نہیں بنے اور اس مقدمہ پر کوئی مفصل تحریر، تجزیہ اور تنقیح بھی سامنے نہیں آئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ یہ مقدمہ جو حضرت شیخ الہند کی اس عظیم خدمت کی روح اور اس ترجمہ میں شیخ الہند کے مقاصد کا ترجمان، ترجمہ قرآن کریم میں شیخ الہند کے اصولوں، اس سے پہلے

اردو ترجموں میں ترمیم واصلاح کی ضرورت پر شیخ کے نظریات اور قدیم اردو ترجموں کی بعض تعبیرات میں ترمیم اور اہل زمانہ کے لئے قرآن شریف کے مطالب ومفہوم کو آسان کرنے اور ہر ایک تک قرآن کریم کا پیام پہنچانے کی اس تدبیر کا پس منظر کیا ہے؟ اس ترجمہ شیخ الہند کی کیا خصوصیات وامتیازات ہیں؟ اس مقدمہ میں ان سب کا تذکرہ اور نہایت قیمتی چشم کشا بحثیں ہیں، بعض اور مباحث پر اہم اشارات، اور تبصرے ہیں۔

مگر جب آج تک کسی نے اس پر، بھی غور نہیں فرمایا کہ حضرت شیخ الہند سے منسوب یہ گراں بہا، گراں قدر مقدمہ، جب حضرت شیخ الہند کی حیات [۱۳۳۹ھ] میں شائع ہونے کے لئے، پریس جاچکا تھا اور شیخ کی وفات کے فوراً بعد، چھپ کر پریس سے آ گیا تھا، تو اس پہلی اشاعت کے متن سے معروف ومطبوعہ مقدمہ کا متن، کیوں بہت مختلف ہے، بعد کی معروف اشاعت میں اور اس مقدمہ کے مشتملات میں فرق کیوں ہے؟ بعد کی طباعتوں میں کثیر ترمیمات واضافات اور تغیرات ہیں، اس دوسری اشاعت یا مقدمہ کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے، یہ ترمیمیں واضافے کس نے اور کس وقت کئے ہیں؟ اسکے متعلق اہل علم کی کیا رائے اور فیصلہ ہے؟ نیز ان دونوں میں سے کس اشاعت کو اصل ومعتمد سمجھا جائے؛ کس کو متاخر اور ثانوی قرار دیا جائے؟ یہ سوال بھی جواب چاہتا ہے کہ کیا یہ ترمیمات واضافات، شیخ الہند کی ہدایت کے مطابق، ان کی سرپرستی میں، یا ان کی زندگی میں ہوئے؟ یا شیخ کے علم واطلاع کے بغیر اور ان کی وفات کے بعد، وجود میں آئے؟ اگر ایسا ہے تو اس کثیر حذف واضافے کے بعد، اس مقدمہ کا شیخ الہند سے انتساب، کس حد تک معتبر اور علمی روایات کے مطابق ہوگا؟ مگر آج تک اس پر اس حیثیت سے توجہ نہیں کی گئی، بلکہ ابھی تک تو خود اصل ترجمہ کے بعض متعلقات بھی، فاضلین کی توجہ کے منتظر اور تشنۂ تحقیق ہیں۔ ترجمہ شیخ الہند کے بعد اردو میں قرآن مجید کے جو ترجمے ہوئے، ان پر ترجمۂ شیخ الہند نے، کس طرح کے اور کیا کیا اثرات قائم کئے؟ اس کے کیا کیا منافع اور ثمرات ظاہر ہوئے؟ اور اس ترجمہ کے بعد سے، عصر حاضر تک، خود اس ترجمہ میں کن اصلاحات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟ میری ناچیز معلومات میں ان موضوعات وعنوانات کے کسی گوشہ پر بھی، مفصل مقالہ یا کتاب تو کیا، شاید اچھا مضمون بھی نہیں لکھا گیا۔

موضح فرقان [ترجمہ شیخ الہند] کے معروف ومتداول نسخوں کا، حضرت مترجم کے اصل نسخہ، یا کم سے کم سب سے پہلی طباعت سے، حرفاً حرفاً مقابلہ اور ترجمہ شیخ الہند کی ایک نئی صحیح ومستند نسخہ کی طباعت کا التزام اور اس ترجمہ کی خصوصیات ومتعلقات کا مفصل جائزہ، اہل علم ونظر کی ایک معتبر جماعت کی توجہ اور خاصا وقت

چاہتا ہے، اس بڑی خدمت کی جانب توجہ دلانے اور انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہونے کے خیال سے، یہاں صرف مقدمہ ترجمۂ شیخ الہند کے متعلق، چند ابتدائی معروضات پیش کی جائیں گی، مقدمہ ترجمہ شیخ الہند کے قدیم وجدید طباعتوں کے متون میں، بنیادی اختلافات کی تفصیل اور اس کے بعض متعلقات کی معلومات پیش کرنے سے پہلے، ضروری ہے کہ ترجمہ شیخ الہند یعنی موضح فرقان، کی تالیف، اس کی طباعت، اس کے حواشی کی ترتیب وتالیف اور ان کی مکمل اشاعت کے متعلق، بعض گوشے واضح کردیئے جائیں۔ کیوں کہ یہ معلومات واطلاعات بھی آج تک کہیں یک جا نہیں کی گئی ہیں، اس لئے ان کا یک جا مطالعہ ترجمہ شیخ الہند کے کئی عنوانات کو نمایاں کرے گا، اس کے مطالعہ سے اہل علم وکمال کی نگاہیں مزید گوشوں کو آشکارا فرمائیں گیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ! [1]

شیخ الہند کا ترجمہ قرآن، پس منظر: برصغیر ہند میں قرآن کریم کے ترجموں کی روایت بہت پرانی اور خاصی مستحکم تھی، لیکن اس کی تجدید اور مستقبل قریب وبعید میں قرآن کریم کی خدمات اور مسلمانان ہند میں اس کا ذوق عام کرنے اور ہر اک طالب ہدایت اور مسافرین راہ خدا کو، صدق ویقین اور نجات کی صراط مستقیم تک پہنچانے میں، سب سے بڑا اور اہم ترین حصہ، حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادۂ گرامی منزلت کا ہے۔ جس کی ابتدا حضرت شاہ صاحب کی ''الزہراوین'' سے ہوئی اور یہ سلسلہ فتح الرحمٰن، فتح العزیز اور بالآخر موضح قرآن حضرت شاہ عبدالقادر تک پہنچا اور برصغیر ہند کی قرآنی خدمات کا مینارۂ نور اور خدمت قرآن مجید کی راہ کا سنگ میل بن گیا۔

یہ بات بلا تکلف وتأمل کہی جاسکتی ہے کہ گذشتہ ڈھائی سو سال میں، ہندپاکستان میں خدمت قرآن مجید کے حوالہ سے جو بھی کام ہوئے ہیں، جس قدر بھی خدمات انجام دی گئی ہیں اور جو ترجمے وغیرہ وجود میں آئے ہیں، وہ سب ہی اسی خاندان کے نقوش قدم کی پیروی کرکے، خصوصاً موضح قرآن کی روشنی اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے، مرتب ومکمل ہوئے ہیں۔

(۱) شیخ الہند کے ترجمہ کے امتیازات، علمی فنی خصوصیات، بعد کے ترجموں پر اس کے اثرات، یا اس کے مقدمہ کے مندرجات اور تفصیلی جائزہ پر کوئی قابل ذکر کام بلکہ اچھا مضمون بھی میرے علم میں نہیں ہے۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی اور مولانا انوار خورشید لاہور کی، شیخ الہند اور فاضل بریلوی، احمد رضا خاں صاحب کے ترجمہ کے تقابل پر، ایک ایک کتاب چھپی تھی مگر دونوں میں شیخ الہند کے مقدمہ کا مفصل تذکرہ ومطالعہ شامل نہیں ہے۔

یوں تو موضح قرآن ترجمۂ حضرت شاہ عبدالقادر کے بعد، قرآن کے اردو میں ترجموں کا ایک طاقت ور نظام یا معمول شروع ہو گیا تھا،[1] اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ قرآن مجید تک اردو میں دس بارہ ترجمے وجود میں آ گئے تھے، جو علیحدہ، یا ان مترجمین کی مؤلفہ قرآن کریم کی تفسیروں کے ساتھ، شائع ہو چکے تھے مگر ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر کے بعد سب سے پہلے، جس ترجمہ نے عام مقبولیت حاصل کی، اس کی اشاعت ایک لاکھ تک پہنچی، وہ ڈپٹی نذیر احمد [بجنوری ثم دہلوی] کا ترجمۂ قرآن مجید ہے، جو ۱۳۱۴ھ [۱۸۹۶ء] میں مرتب و مکمل ہوا۔[2] یہ ترجمہ چوں کہ خاص طلب اور ضرورت کے وقت سامنے آیا تھا، اس لئے اس کی تیزی سے فروخت اور اشاعت ہوئی، اس ترجمہ کو اس طبقہ میں بہت پذیرائی ملی، جو ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات نیز سرسید احمد کے خیالات سے کسی درجہ میں متأثر تھا، مگر اس ترجمہ میں، قرآن مجید کے مقاصد و مطالب کی ترجمانی اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہت سے مقامات پر غلطی اور متعینہ حدود سے انحراف ہو گیا تھا، اسی لئے اس پر متعدد علمی تنقیدیں لکھی گئیں، مفصل تبصرے بھی کئے گئے، یہ سب چیزیں چھپیں اور ان سے استفادہ بھی ہوا۔ ایک صاحب نے خود مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے براہ راست خط و کتابت کی اور اس مفید مجموعۂ مراسلت کو، مرتب کر کے شائع بھی کر دیا تھا۔ اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ سے پہلے ایک

---

(۱) ممکن ہے یہاں بعض پڑھنے والوں کو ترجمہ قرآن مجید منسوب بہ شاہ رفیع الدین کی یاد اور خیال آئے، اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اردو میں قرآن کریم کے ایک معروف اردو ترجمہ کا، حضرت شاہ رفیع الدین سے انتساب، علمی طور سے ثابت نہیں۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: راقم سطور کا مضمون، یہ مضمون مجلّہ فکر و نظر اسلام آباد [پاکستان] کو چھپنے کے لئے بھیجا گیا تھا جو فکر و نظر کی اشاعت شعبان/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ [اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۴ء] میں چھپا ہے، مگر اس مضمون کے عنوان و مطالب، حد یہ کہ اہم نادر ترین کتابوں سے اخذ اقتباس میں بھی، حق مدیر کے نام پر، ایسی ترمیمات اور تغیرات کئے گئے، جس سے یہ مضمون تقریباً بے مقصد ہو گیا تھا۔ کوئی بتائے تو سہی، کہ جن عقل مندوں کو شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن مجید، موضح قرآن اور ترجمہ منسوب بہ شاہ رفیع الدین کا فرق معلوم نہیں اور وہ ترجمہ شاہ رفیع الدین کا نام موضح قرآن لکھ رہے ہوں، انہیں ایسے مضامین میں ترمیم کا کیا حق ہے؟ ان کو تو ایسے مضامین و مقالات شاید پڑھنے بھی نہیں چاہئیں۔ اس شمارہ میں اس مضمون کے ساتھ یہی زیادتی نہیں کی گئی، بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اہم مخطوطات اور نادر ترین مطبوعہ مآخذ کے اقتباسات کی عبارتیں تبدیل کر دی گئیں۔ میں نے یہ دیکھا تو اس وقت کے مدیر کو لکھا کہ یہ کیا حرکت ہے! جواب ملا کہ مضامین تین تین ماہرین کو بھیجے جاتے ہیں، ان کی رائے اور ترمیمات کے بعد ہی چھاپے جاتے ہیں، میں نے پھر دریافت کیا کہ بمہربانی ان بے خبر ماہرین کے نام لکھئے، جو قرآن کریم کے معروف و مشہور اردو ترجموں سے اس قدر بے خبر اور نا آشنا ہیں، اس خط کا آج تک جواب نہیں ملا۔ کس سے شکایت کی جائے؟ یہ مضمون بعد میں ہندوستان میں دو تین رسائل میں شائع ہو گیا تھا۔

(۲) مقدمہ ڈپٹی نذیر احمد، بر ترجمہ قرآن مجید ص:۸، [دہلی: ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء] ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ ۱۸۹۵ء [۱۳۱۲ھ] میں مطبع قاسمی دہلی سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔

اور ترجمہ بھی چھپ کر عام ہو چکا تھا، یہ ترجمہ مولانا عبدالحق حقانی کی گراں قدر اور علوم قرآنی کی جامع ،مشہور تفسیر،تفسیر حقانی کے ساتھ شامل ہے۔[۱] مولانا حقانی نے صراحت کی ہے کہ یہ ترجمہ خود میرا کیا ہوا ہے،لیکن یہ ترجمہ تفسیر حقانی سے الگ ہو کر نہیں چھپا،اس لئے اس کی ویسی شہرت اور تعارف نہیں ہوا،جیسا اور ترجموں کا تعارف ہے۔اس کے بعد سب سے پہلے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا ترجمہ قرآن مجید وجود میں آیا اور شائع ہوا،[۲] اس کے بعد مولانا فتح محمد جالندھری کا ترجمہ ٔقرآن مجید شائع ہوا،[۳] چوتھا نہایت اہم ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مبارک قلم کا ہے[۴] ان تینوں کے بعد شیخ الہند،مولانا محمود حسن نے،اسی طرح کی ایک اور خدمت قرآن کا ارادہ فرمایا۔[۵] شیخ الہند کا یہ ترجمہ،ڈپٹی نذیر احمد اور حضرت مولانا تھانوی وغیرہ کے کام کی توسیع بھی ہے اور ان سے اک حد تک مختلف بھی۔

درج بالا چاروں علمائے کرام نے ،قرآن مجید کے اپنے اپنے ذوق ومزاج،اپنے اپنے معیارات اور فکر وبصیرت کے مطابق ترجمے کئے،لیکن شیخ الہند نے اپنے وفورِ علم اور علوے شان کے باوجود، نئے ترجمے کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے موضح قرآن کی تسہیل اور اپنے دور کے لحاظ سے،اس کی معنویت کو مزید واضح کرنے اور اس کی تعبیرات وزبان کو آسان بنانے کی کوشش کی۔مقدمہ ٔترجمہ قرآن مجید شیخ الہند،طبع اول بجنور میں،اس کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے:

> ’’اس ننگ خلائق کو یہ خیال ہوا، کہ حضرت شاہ صاحب ممدوح کے مبارک مفید ترجمہ میں، لوگوں کو جو کُلّی دو خلجان ہیں،یعنی ایک بعض الفاظ ومحاورات کا متروک ہو جانا۔دوسرے بعض بعض مواقع میں،ترجمہ کے الفاظ کا مختصر ہونا، جو اصل میں تو ترجمہ کی خوبی تھی،مگر

(۱) ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ ٔقرآن مجید ۱۳۱۴ھ[۱۸۹۶ء] میں مکمل ہوا،تقریباً اسی دور میں مولانا عبدالحق حقانی دہلوی نے ترجمہ قرآن کا اختتام فرمایا۔

(۲) مولانا عاشق الٰہی کے ترجمہ کی تحریر کا کام ۱۳۱۶ھ[۹۹-۱۸۹۸ء] میں شروع ہوا،۱۳۱۸ھ[۱۹۰۱ء] میں اختتام پذیر ہوا۔

(۳) مولانا فتح محمد کے ترجمہ کی تکمیل کا سنہ محقق طور پر معلوم نہیں،مگر یہ ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کے ساتھ ہی مکمل ہو گیا تھا، لیکن اس کی طباعت میں دیر ہوئی،۱۳۲۵ھ[۱۹۰۸ء] میں پہلی مرتبہ شائع کیا گیا۔

(۴) حضرت مولانا تھانوی نے تفسیر بیان القرآن اور ترجمہ قرآن کریم کی تالیف ۱۳۲۳ھ[۱۹۰۵ء] میں شروع فرمائی تھی، جو وسط ۱۳۲۵ھ[۱۹۰۷ء] میں ختم ہوئی۔

(۵) شیخ الہند کا ترجمہ،۱۳۳۶ھ[جولائی ۱۹۱۸ء] میں تکمیل کو پہنچا۔

ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت، اب یہاں تک نوبت آ گئی کہ جس سے ایسے مفید وقابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سو اگر غور واحتیاط کے ساتھ، اُن الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ، لے لئے جاویں اور اختصار واجمال کے موقعوں کو، تدبر کے ساتھ کوئی لفظ مختصر زائد کر کے، کچھ کھول دیا جاوے، تو پھر انشاء اللہ حضرت شاہ صاحب کا یہ صدقہ فاضلہ بھی جاری رہ سکتا ہے اور مسلمانان ہند بھی، اُس کے فوائد مخصوصہ سے خالی نہ رہ جاویں گے۔

اس مضمون کو سوچ سمجھ کر، جو اپنے مکرمین مخلصین کی خدمت میں پیش کیا، تو ان حضرات نے بھی اس عاجز کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا اور یہی بات دلنشین ہوگئی کہ مستقل ترجمہ سے یہ امر زیادہ مناسب اور مفید ہے، کہ موضح قرآن میں جو شکایت پیدا ہوگئی ہے، اُس کے رفع کرنے میں کوشش کی جاوے۔ جب یہاں تلک نوبت پہنچ چکی، تو یہ عاجز بنام خدا اس خدمت کے انجام دینے کے لئے تیار ہو بیٹھا، گویا دوشالہ میں کمبل سے جگہ جگہ رفو کرنے کا ارادہ کر دیا، جب ایک ثلث قرآن کا ترجمہ کر چکا، تو بوجہ بعض عوارض، ایسا طول طویل حرج پیش آیا، کہ ترجمہ کی تکمیل کی توقع بھی دشوار ہوگئی، مگر بتوفیق الٰہی، عین ایام حرج میں اتنا اطمینان نصیب ہوگیا، کہ ترجمہ موصوف باطمینان ۱۳۳۶ھ میں پورا کرلیا۔"[۱]

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، میرے خیال میں اس معروف مقدمہ کا شیخ الہند سے انتساب درست نہیں، شیخ کی زندگی میں شائع مقدمہ ترجمۂ قرآن مجید کی صرف آخری سطور آئی ہیں، ابتدائی حصہ، مقدمہ طبع اول، مطبع قاسمی دیو بند میں شامل نہیں۔

اس ترجمہ کے لئے تحریک: حضرت شیخ الہند نے مقدمہ ترجمہ قرآن میں، اپنے احباب مکرمین کا نام لئے بغیر، لکھا ہے کہ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد:

(۱) مقدمہ ترجمہ شیخ الہند، مشمولہ، ترجمہ شیخ الہند، [بجنور: ۱۳۴۴ھ] اس اشاعت میں صفحات کا شمار اس مقدمہ کے جملہ مضامین ومشتملات کے لحاظ سے ہے، یہ اصل مقدمہ کا دوسرا صفحہ ہے۔
مقدمہ ترجمہ شیخ الہند کی پہلی طباعت کی عبارت اس سے خاصی مختلف اور مختصر ہے۔ ملاحظہ ہو: طبع اول: ص: ۷-۸-۹ [دیو بند:] [نور]

''ان ہی احباب مکرمین کی خدمت میں اس ترجمہ کو پیش کر کے، تفصیلی نظر کی درخواست کریں گے۔''[۱]

یہ حضرات کون تھے اور کس کی فرمائش پر یہ بڑی خدمت انجام دی گئی، حضرت شیخ الہند کے مقدمہ یا کسی اور تحریر میں وضاحت نہیں ہے، لیکن [شیخ الہند کے معتمد سوانح نگار] مولانا سید اصغر حسین صاحب نے صراحت کی ہے، کہ یہ فرمائش اور اصرار کرنے والے، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری تھے۔ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کا عمومی تعارف، ایک بڑے عارف اور نامور مرشد کا ہے، لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ حضرت مولانا رائے پوری، علوم القرآن کے بہت بڑے فاضل، تراجم قرآن کے خاص ماہر، محقق مبصر اور بڑے شناور تھے۔[۲]

مولانا رائے پوری کو قرآن کریم کی تعلیم اس کے مکتب بستی بستی قائم کرنے، قرآن کریم کے الفاظ ومطالب کو، ہر اک مسلمانوں تک پہنچانے کا غیر معمولی شغف تھا، قرآن کریم کی توسیع وتعلیم اور اس کا پیام عام مسلمانوں تک پہنچانے کی فکر میں ہمیشہ مصروف اور بے چین رہتے تھے،[۳] مولانا رائے پوری کی ان ہی خدمات کا ایک اثر، شیخ الہند کا ترجمہ قرآن بھی ہے۔ مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی نے لکھا ہے کہ:

(۱) مقدمہ ترجمہ شیخ الہند ص:........[طبع اول، بجنور]

(۲) مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے قرآن کریم کے غیر معمولی وابستگی، قرآن مجید کے مختلف ترجموں سے واقفیت اور ان کے متعلقات پر نظر، حضرت شاہ صاحب کے کتاب خانہ پر نظر ڈالنے سے، اب بھی کہا جاسکتا ہے، حضرت رائے پوری کا علوم القرآن پر بہت عمدہ، نہایت وسیع کتب خانہ تھا، افسوس ہے کہ اس کی حفاظت کا پوری طرح اہتمام نہیں ہوسکا، اس کا ایک حصہ اب بھی خانقاہ رائے پور [سہارنپور۔ یوپی انڈیا] میں موجود ہے۔

(۳) اس کا اثر یہ تھا کہ پورا پنجاب، حضرت کے قائم کئے ہوئے مکتبوں اور مدرسوں سے آباد و پر بہار تھا، ان مکتبوں میں ہزار ہا ہزار بچے پڑھتے اور قرآن مجید کے علاوہ، متعدد مدرسوں میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ اسی شغف اور قرآن مجید سے غیر معمولی تعلق کی وجہ سے، حضرت شاہ عبدالرحیم نے اپنے پیر بھائی، مولانا نور محمد لدھیانوی جن کا لدھیانہ میں اپنا ایک بڑا مدرسہ تھا، مکتبوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، ایک مطبع جاری تھا، اور اس سے ایک ماہانہ رسالہ بھی چھپتا تھا، اپنے تعاون اور اس سلسلہ کو زیادہ وسعت اور اہتمام کے ساتھ، آگے بڑھانے کے لئے، رائے پور بلالیا تھا۔ اسی اخلاص کا ایک نہایت پر بہار اور دائمی نفع، نورانی قاعدہ کی تالیف بھی تھی، جو مولانا نور محمد صاحب نے حضرت مولانا کی فرمائش پر لکھا تھا، جو تقریباً سو سال سے برصغیر کے اکثر مکتبوں اور تعلیم قرآن مجید کے مقبول اعلیٰ ترین قاعدہ ہے، اور ادھر آٹھ دس سال سے اس کی افادیت کا دائرہ عالم گیر ہوگیا ہے، تعجب ہے کہ بہت سے عرب ملکوں میں تعلیم قرآن مجید کی ابتداء، اسی نورانی قاعدہ سے ہوتی ہے، کم سے کم تین عربی ترجمے اور ان کی متعدد طباعتیں، میری نظر سے گزری ہیں، اسی طرح یورپ امریکہ، کناڈا وغیرہ سب جگہ، یہی قاعدہ معمول ومروج بلکہ نہایت مقبول ہے۔

''بعض اہل علم کی استدعا اور بہت سے مصالح اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی غایت آرزو دیکھ کر، حضرت مولانا کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا خیال ہوا''[۱]

اس سلسلہ میں ایک روایت میں، مولانا قاری محمد طیب صاحب کے حوالہ سے، مولانا حافظ احمد [خلف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی] کا نام بھی لیا گیا ہے، کہ مولانا احمد صاحب نے بھی شیخ الہند سے، ترجمہ قرآن مجید کی فرمائش اور اس کے لئے مکرر گذارش کی تھی۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس ترجمہ کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی، ترجمۂ شیخ الہند [توضیح الفرقان] کی تالیف ۱۳۲۷ھ [۱۹۰۹ء] میں اور اس سے مشکل آٹھ دس سال پہلے، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے قرآن مجید کا جو ترجمہ کیا تھا وہ بتمام وکمال شیخ الہند کی نظر، کامل تصحیح اور حرفاً حرفاً ترمیم ومطابقت سے گزر کر، شائع ہوا تھا۔ مولانا میرٹھی نے اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھا ہے:

''من اولہ الی آخرہ، مولانا المکرّم، قدوۃ العلماء حضرت مولوی محمود حسن صاحب، مدرس اول، مدرسہ اسلامیہ، دیوبند کی نظر سے گزرنے کے بعد طبع ہوا تھا''[۲]

مولانا میرٹھی نے ترجمۂ قرآن مجید کا ۱۳۱۶ھ [　　] میں آغاز کیا تھا اور شیخ الہند کے ترجمہ کے وقت وہ چھپنے کے لئے چلا گیا تھا۔

اس ترجمہ کی تصحیح کے لئے، شاہ عبدالرحیم رائے پوری سے شیخ الہند کی لفظ بہ لفظ مراجعت اور تحقیق کا اہتمام: شیخ الہند کا معمول تھا کہ ترجمہ کا جو حصہ مکمل ہوجاتا اس کو شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے سامنے رکھتے، شاہ عبدالرحیم سے اس پر کھل کر گفتگو، بلکہ بحث ومباحثہ ہوتا، حضرت مولانا رائے پوری کی رائے بحث وتنقیح کے بعد ہی، ترجمہ کے اس حصہ کو معتبر ومکمل سمجھا جاتا تھا۔[۳] یعنی وہ ترجمہ اور صفحات جو حضرت مولانا رائے پوری کے مطالعہ ونظر سے گذر جاتے تھے، شیخ الہند کی نگاہ میں پوری طرح قابل اعتماد ہوجاتے تھے،

(۱) سوانح شیخ الہند۔ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی۔ ص:۲۳۶ [ادارہ اسلامیات، لاہور:۱۹۷۷ء]

(۲) تمہید ص:۵ ترجمہ مولانا میرٹھی۔ [طبع چہارم، میرٹھ:۱۳۳۳ھ]

(۳) تذکرہ شاہ عبدالرحیم رائے پوری، تالیف مفتی عبدالخالق صاحب میں، اس سلسلہ کی بعض جزئیات نقل کی گئی ہیں۔ ص:۱۵۲، ۲۱۳، [طبع اول مکی دارالکتب لاہور، ۱۹۹۸ء] مگر اس کے لئے معتبر حوالوں کی ضرورت تھی، جو پوری نہیں ہوئی۔

لیکن مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی حیات میں، ہندوستان میں، شیخ الہند کے ہندوستان کے قیام کے وقت تک، صرف سورۂ توبہ تک، ترجمہ ہوا تھا، اس لئے مولانا رائے پوری کی تصحیح ونظر ثانی سے، صرف یہی ابتدائی [ایک تہائی] حصہ آراستہ ہے، اس سے پہلے کہ ترجمہ کا عمل اور آگے بڑھتا، شیخ الہند سفر حج کے لئے روانہ ہو گئے، اور جب شیخ الہند اس طویل سفر اور مالٹا سے ہندوستان واپس پہنچے تو مولانا شاہ عبدالرحیم کی وفات ہو چکی تھی۔

ترجمہ کی تالیف وتحریر کا آغاز: شیخ الہند کے الفاظ میں گزر گیا ہے کہ، قرآن مجید کے ایک نئے ترجمے اور اس کی نوعیت کے سوال پر، شیخ نے لمبے عرصہ تک غور وفکر کیا تھا، اس مقصد اور منصوبہ پر عمل کے لئے اپنے ممتاز احباب اور اہل فضل وکمال سے، مشورے اور تبادلۂ خیالات کرتے رہے تھے۔ لمبے غور وخوض کے بعد، یہ فیصلہ ہوا کہ نئے ترجمہ کی ضرورت نہیں، صرف حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کریم، ''موضح قرآن''، کو، شیخ الہند کے دور کے پڑھنے والوں کی صلاحیت کے مطابق، آسان کر دیا جائے۔ اس رائے یا مشورہ پر عمل کرتے ہوئے، شیخ الہند نے ربیع الاول ۱۳۲۷ھ [مارچ اپریل ۱۹۰۹ء] میں موضح قرآن کی تسہیل یا اس ترجمہ کا کام شروع کر دیا تھا، جو ترجمہ شیخ الہند کے نام سے چھپا اور معروف ہوا۔[ا]

تسہیل وترجمہ کا یہ سلسلہ جو ۱۳۲۷ھ میں شروع ہوا تھا، تین سال میں صرف دس پاروں تک پہنچا تھا، جس کا سورۂ توبہ کے اختتام پر، تاریخ اختتام، تصحیح ترجمہ سورۂ توبہ سے علم ہوتا ہے۔ شیخ الہند نے یہ تاریخ اس طرح رقم فرمائی ہے:

''تمت سورۂ توبہ- والحمد للہ- ۲۵/ جمادی الثانیہ ۱۳۳۰ھ، دیوبند''

خیال رہے کہ شیخ الہند کے ترجمہ میں، کسی سورت کے اختتام پر، تاریخ تالیف کی صراحت کا یہ پہلا موقع ہے اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ترجمۂ شیخ الہند میں درج، تمام تاریخہائے تحریر وکتابت میں سے یہ پہلا اندراج ہے، جس میں مقام تحریر دیوبند درج ہے، اس کے علاوہ کسی اور سورت کے آخر میں، دیوبند کی صراحت نہیں اور یہی سطور، اس ترجمہ میں، شیخ الہند کے ہندوستان میں قیام کے زمانہ کی آخری یادگار ہیں۔ شیخ الہند

(ا) تحریر مطبوعہ بر مقدمہ طبع اول نیز ملاحظہ ہو: تذکرہ شیخ الہند، تالیف: مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری۔ ص:۱۲۸، [کراچی: ۱۴۲۸ھ، ۲۰۰۷ء]

ب: مقام محمود [مجموعہ مقالات، شیخ الہند سمینار ۱۹۸۶ء] مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ ص:۲۷، ص:۱۵۳ و مابعد [دہلی: بلاسنہ]

ترجمہ قرآن کی ترتیب میں، سورۂ توبہ تک پہنچے تھے کہ سفر حرمین کا ارادہ ہو گیا۔ حضرت مولانا کا ہندوستان سے، سفر حجاز کے لئے روانگی کے وقت، حجاز میں تقریباً ایک سال یا کچھ زیادہ قیام کا خیال تھا، اس قیام میں اور مصروفیات کے علاوہ، قرآن کریم کے ترجمہ کی تکمیل بھی پیش نظر تھی، اسی ارادہ کی وجہ سے، ہندوستان سے جاتے وقت، علوم القرآن، تفاسیر، قرآن کے ترجموں اوران کے متعلقات پر، کتابوں کا ایک بڑا عمدہ منتخب ذخیرہ، جو کئی صندوقوں پر مشتمل تھا، ساتھ لے لیا تھا، جو پورے سفر میں معاون، رفیق راہ اور نہایت مددگار ثابت ہوا۔

مولوی مجید حسن [ترجمہ شیخ الہند کے سب سے پہلے ناشر[1]] نے، ترجمہ شیخ الہند کے تعارفی اشتہار میں لکھا ہے:

> ''جس کے دس پاروں کا ترجمہ، مولانا مرحوم، وطن شریف [دیوبند] میں فرما چکے تھے، اس کے بعد حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے مولانا، کئی صندوق کتابوں کے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے''۔[2]

حضرت مولانا مدینہ منورہ میں تھے کہ برطانوی حکومت کی ہدایت کے مطابق، شریف مکہ [حسین] نے مولانا کو گرفتار کر کے، انگریزوں کے حوالہ کر دیا، انگریزوں نے حضرت مولانا کے لئے، جزائر مالٹہ میں نظر بند، کئے جانے کی سزا طے کر کے، شیخ کو ان کے ساتھیوں کے ساتھ، مالٹہ (Malta)[3] بھیج دیا تھا۔

---

(۱) مولوی مجید حسن [سہ روزہ مدینہ بجنور] کے بانی، مالک اپنے دور کے ممتاز صحافی صاحب فکر بلکہ فکر ساز صحافی اور دانشور تھے ۲۷/ رجب ۱۳۸۶ھ، [۱۱/ نومبر ۱۹۶۶ء] کو وفات ہوئی۔ حالیہ دنوں میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک اسکالر [Scholar] نے مدینہ بجنور پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کیا ہے۔

(۲) یہ اشتہار جو مدینہ اخبار، بجنور کے ۱۳/ اگست ۱۹۲۳ء کے ضمیمہ کے طور پر، ایک علیحدہ کاغذ پر چھپا تھا، دو بڑے صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ایک جانب ترجمہ شیخ الہند اور حواشی وافادات سورۂ بقرہ کا نمونہ ہے، دوسرے صفحہ پر مفصل اشتہار ہے۔ یہ اشتہار ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

مولوی مجید حسن صاحب کی یہ صراحت اور اشتہار، ان لوگوں کی تردید کے لئے بہت ہے، جنہوں نے لکھا ہے کہ مالٹہ میں ترجمہ کے وقت، شیخ الہند کے پاس کوئی کتاب اور اس خدمت میں معاونت کے لئے علمی سرمایہ یا ماٰخذ موجود نہیں تھے۔

(۳) مالٹہ (Malta) ایک جزیرہ اور اب ایک خود مختار حکومت ہے، جس میں اور جزیرے بھی شامل ہیں۔ جنوبی یورپ میں بحیرہ روم (SeaRome) کے کنارہ پر، سسلی، صقلیہ اور تیونس کے درمیان میں ہے۔ اس کا رقبہ تین سو سولہ مربع کلومیٹر [ایک سو بائیس میل] ہے۔ مالٹہ برطانوی فوجوں کا بحری اڈہ اور اسی طرح کا ایک بڑا قید خانہ تھا، جیسا حالیہ دنوں میں امریکہ کا ایک بڑا جیل خانہ، گونتانا موبے (Gontanamobey) ہے۔

بعض معلومات کے لئے دیکھئے: الف: جامع اردو انسائیکلوپیڈیا۔ [سماجی علوم] ص: ۴۳۳، جلد: ۴، [دہلی: ۲۰۰۰ء]

ب: جدید دنیا کے تمام ممالک، ڈیرک اوبرائن۔ ترجمہ محمد اختر ص: ۳۵۵/ ۳۵۶

[دار الشعور، لاہور۔ ۲۰۱۳ء]

حضرت مولانا ۲۹؍ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ [۲۳؍فروری ۱۹۱۷ء] کو مالٹہ پہنچے تھے، سامان، خصوصاً کتابوں کے پہنچنے میں، جیسا کہ ایسے معاملات میں ہوتا ہے، غالبًا خاصی دیر لگی ہوگی، شاید اسی وجہ سے مالٹہ میں ترجمے وتسہیل موضح قرآن کا سلسلہ، مالٹہ پہنچنے کے بعد شروع ہوا۔ سورۂ یونس کے اختتام پر درج سورت کے ترجمہ کی تاریخ، ۱۳/ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ [اگست ۱۹۱۷ء] سے، اس کی تصدیق ہورہی ہے۔ شیخ الہند نے ایک موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ماشاء اللہ مالٹہ میں کام کی رفتار، ہندوستان کی نسبت بہت تیز رہی''

مالٹہ میں حضرت مولانا کے اکثر اوقات، ترجمہ پر نظر ثانی اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے میں صرف ہوتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مالٹا کے صرف ایک سال کے قیام میں، بیس پاروں کا ترجمہ مکمل ہوگیا تھا، سورۂ والناس کا ترجمہ، ۲؍شوال ۱۳۳۶ھ [۱۲؍جولائی ۱۹۱۸ء] کو مکمل ہوا۔ یہاں شیخ الہند نے تحریر فرمایا ہے:

''ولـلّٰـه الحمد اولاً و آخراً وظاهراً وباطنا، ربناتقبل منا انك انت السميع العليم، ربنالاتواخذنا ان نسينا او اخطانا ''۲؍شوال [فی اسر مالطہ]

مالٹا میں ترجمہ کی رفتار، شیخ الہند کے قلم سے: ترجمۂ قرآن کی تحریر کے دوران، شیخ الہند کا ایک خاص معمول یہ تھا، کہ وہ ہر سورۃ کے اخیر میں، اس کی تاریخ اختتام تحریر فرمادیتے تھے۔ مولوی مجید حسن صاحب نے اس یادداشت کے تمام مندرجات کو [جو بظاہر معمولی بات ہے] شیخ الہند کے ترجمہ کے حاشیوں پر نقل کر کے محفوظ کردیا ہے۔ مولوی مجید حسن نے لکھا ہے:

''حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہر مسودہ کے اختتام پر تاریخ وماہ سن لکھ کر، کہیں: مالطه فی الاسر، الحمدللّٰه، کسی جگہ: مالطه الحمدللّٰه تحریر فرمایا ہے اور میں نے بھی اس تاریخی شے کو، قرآن مجید کے حاشیہ پر لکھوادیا ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں تاریخ [تک] اور اتنے عرصے میں، آپ نے اس قدر اور فلاں حصہ، قرآن مجید کا ترجمہ فرمایا''[1]

اس قیمتی یادداشت سے، بعد والوں کو اس ترجمہ کی رفتار کار معلوم ہوجاتی ہے، اس کو دیکھ کر علمی کاموں میں قوت آتی ہے، عمل کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر، تین سورتوں کے آخر میں رقم

(۱) تحریر مولوی مجید حسن صاحب۔ برآغاز طبع اول، ترجمہ شیخ الہند

تاریخیں نقل کی جارہی ہیں:

تمت سورة التوبة ــ والحمدلله ــ ۲۵/ جمادی الثانی ۱۳۳۰ھ، دیوبند ــ [ص:۳۲۹]

اختتام سورة النمل ــ ۲۷/ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ، مالطه فی الاسر ـ والحمدلله ــ [ص:۶۱۴]

اختتام سورة العلق ــ ۲۸/ رمضان، ۱۳۳۶ھ مالطه فی الاسر ـ والحمدلله ــ [ص:۹۵۴]

ترجمہ کی خدمت میں، شیخ الہند کے کاتب اور معاونین: شیخ الہند نے اپنے اس ترجمہ یا تسہیل موضح قرآن کے آغاز پر، اس خدمت وعمل کے لئے ایک نظام مقرر فرمالیا تھا، جس میں شیخ الہند کے مختلف شاگرد اور کبھی کبھی حاضر خدمت، ممتاز علمائے کرام بھی شریک اور معاون ورفیق رہتے تھے۔ ترتیب یہ تھی کہ اول تفسیروں کا مطالعہ کیا جاتا، قرآن کریم کے متعدد ترجمے سامنے ہوتے، موضح قرآن کو بار بار پڑھ کر، اصلاح وترمیم کے لئے، غور وفکر اور مشورہ کیا جاتا تھا، اس کے بعد ترمیم الفاظ کے لئے قلم کو حرکت دی جاتی تھی۔ اس موقع پر جو شاگرد اور اہل علم موجود ہوتے، وہ اس کی تحریر وکتابت کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ حضرت کے ایک ممتاز شاگرد، مولانا احمد اللہ صاحب [پانی پتی یا کیرانوی؟] بطور خاص اس موقعہ پر حاضر اور اس خدمت میں ہمہ وقت شریک رہتے تھے۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کی اطلاع ہے، جو مولانا کا ایک سے زائد بار کا مشاہدہ ہوگا:

> ''مختلف ترجمے اور معتمد تفسیریں حضرت کے سامنے کھلی رہتی اور خدام وتلامذہ اور فارغ التحصیل طلبہ خدمت میں بیٹھتے تھے اور ان تراجم وتفاسیر کو دیکھتے رہتے۔ آپ کے خادم خاص، مولوی احمد اللہ[1] صاحب خدمت کتابت کو ادا فرماتے اور ایک ایک لفظ بہت سی تحقیق اور غور وفکر کے بعد لکھا جاتا''۔[2]

(۱) شیخ الہند کے شاگردوں میں احمد اللہ نام کے دو اصحاب کا نام ملتا ہے، جو ہم عہد بھی ہیں اور قریب الوطن بھی۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی اور مولانا حمد اللہ کیرانوی مولانا احمد اللہ کا پانی پت کے حوالہ سے ریشمی رومال کے خاص کام کرنے والوں میں ذکر آیا ہے، مثلاً ملاحظہ ہو: تحریک شیخ الہند [ریشمی رومال خطوط، سازش کیس،] ص:۳۲۶، [طبع اول، دہلی: غالباً ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء] دوسرے مولانا حمد اللہ کیرانوی تھے، [وفات:] ممکن ہے ان ہی کو پانی پت میں درس وتعلیم کی وجہ سے پانی پتی لکھ دیا ہو۔ کیرانوی مولانا حسین احمد مدنی کے خاص دوست اور بے تکلف ساتھی تھے۔

(۲) حیات شیخ الہند، مولانا سید اصغر حسین ص:۲۳۶، [ادارہ اسلامیات لاہور: ۱۹۷۷ء]

مالٹہ کے قیام میں بھی تقریباً یہی صورت تھی، فرق صرف یہ ہوا تھا کہ وہاں لکھنے والوں کی ترتیب کچھ بدل گئی تھی۔ مالٹہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل اور مولانا نصرت حسین فتحپوری، شیخ الہند کے کاتب اور بنیادی شریک تھے۔ مولوی مجید حسن نے تمہید ترجمہ شیخ الہند میں لکھا ہے:

''مشاغل ذکر ومراقبہ اور اوراد وظائف وتلاوت کی مصروفیتوں سے جو وقت ملتا، اس میں ترجمہ یا اس پر نظر ثانی فرماتے، جس میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیر گل سے بھی مذاکرات رہتے''[1]

لیکن حضرت مولانا مدنی نے، جن کو ایک عرصہ سے، قرآن شریف حفظ کرنے کے لئے، فرصت کے اوقات اور یکسوئی کی تلاش تھی، جلد ہی خود کو اس خدمت سے علیحدہ کرلیا تھا، اس خدمت میں صرف مولانا عزیر گل اور مولانا نصرت حسین رہ گئے تھے۔ مولانا مدنی کی اطلاع ہے:

''اس کے بعد اکثر ترجمہ قرآن پر نظر ثانی ڈالتے تھے اور کبھی کبھی مولوی نصرت حسین صاحب مرحوم اور مولوی عزیر گل صاحب کو ترجمہ سناتے تھے، کچھ دنوں تک میں بھی اس میں شریک ہوتا رہا، مگر چوں کہ مجھ کو تمام دن میں، قرآن کے دور کے لئے یہی وقت فارغ ملتا تھا، اس لئے میں نے شرکت اس میں چھوڑ دی تھی''۔

دونوں حضرات کی بحثیں بھی ترجمہ کے متعلق، مولانا مرحوم سے ہوتی رہتی تھیں''۔[2]

بہر حال حضرت شیخ کی مسلسل فکر وتوجہ اور حضرت کے رفقائے مالٹہ کے تعاون سے، یہ بڑا کام، جس کے پہلے دس پارے، ہندوستان میں تین سال میں پورے ہوئے تھے، اسی کے آخری بیس پارے[دو تہائی حصہ] وقت کی پابندی، شدت اہتمام اور یکسوئی کی وجہ سے، ایک سال میں مکمل ہوگئے تھے۔

اس ترجمہ کا نام یا عنوان: جب اس ترجمہ یا موضح قرآن کی تسہیل اور تہذیب جدید مکمل ہوگئی، اس وقت اس کے لئے موزوں نام، مشورہ ہوا، شیخ الہند نے اصل مأخذ، موضح قرآن، حضرت شاہ عبدالقادرؒ

(۱) تمہید ترجمہ شیخ الہند [طبع اول بجنور:] ص............

(۲) اسیر مالٹہ۔ تالیف حضرت مولانا حسین احمد مدنی۔ ص:۹۹[طبع اول، بلاسنہ، سوراج پرنٹنگ ورکس دہلی۔ غالباً ۱۹۲۱ء] طبع دوم، ص:۹۸، [مطبع قاسمی، دیوبند]

کی مناسبت سے، اس کا نام ''موضح فرقان'' تجویز کیا۔ حضرت مولانا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارا مبلغ سعی، صرف ترجمۂ موصوف کی خدمت گذاری ہے، جو سب پر مقدم ہے، اور یہ بات بھی روشن ہے کہ اتنی بات سے کہ ترجمہ موصوف میں، ہم نے کچھ الفاظ، وہ بھی اکثر اِدھر اُدھر سے لے کر شامل کردیئے، اس ترجمہ کو ہماری طرف منسوب کرنا، اس سے زیادہ نہیں کہ دوشالہ میں کمبل سے رفو کرکے، اس کو کمبل کہنے لگیں، بہت سے بہت وہ دوچار مٹھی الفاظ، ہماری طرف منسوب ہوسکیں وبس''۔

ترجمہ کا نام موضح قرآن کی ترتیب پر ہے: اسی میں فرماتے ہیں:

اس لئے ترمیم کے بعد اس ترجمہ کا مستقل دوسرا نام تجویز کرنا، ہرگز مناسب نظر نہیں آتا، کیونکہ کہیں کچھ الفاظ شامل کرنے سے، یہ مستقل دوسرا نہیں ہوگیا، لیکن صرف رفع اشتباہ اور دفع التباس کی ضرورت سے خیال ہوتا ہے، کہ اصل ترجمہ کے نام کے سوا، اس کا بھی کوئی نام مخصوص ہو، تو اختلاط والتباس سے پورا بچاؤ رہے گا، سو ''موضح قرآن'' کی مناسبت سے اس کا نام: ''موضح فرقان'' مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر موضح قرآن میں یہ خوبی زائد ہے کہ تاریخی بھی ہے، ''موضح فرقان'' تاریخی نہیں، ہاں گھٹا بڑھا کر کچھ تکلف کے بعد، تاریخی ہوسکتا ہے۔

ترجمہ پر مفصل فوائد کا اضافہ اور مقدمہ کی تالیف: موضح فرقان کی تکمیل، اس علمی سفر کا اختتام نہیں تھا، حضرت مولانا نے غالبًا اول سے ارادہ فرمالیا تھا کہ، حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی تسہیل وتجدید کے بعد، شاہ صاحب کے افادات وحواشی کو بھی آسان کریں گے اور نئی زبان میں منتقل فرمائیں گے، جس میں وقت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھا جائے گا اور نئے پیدا سوالات ومباحث کا حل، پیش کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی، ساتھ ہی ایک مفصل مقدمہ کی ضرورت بھی محتاج بیان نہیں تھی۔ ترجمہ پورا ہونے کے بعد وقت فارغ ہوا، تو اس میں دونوں کام شروع ہوگئے۔ حواشی اور مقدمہ کی ترتیب غالبًا بیک وقت شروع ہوئی ہوگی، مقدمہ کی تالیف، ایسا بڑا کام تھا، نہ ہی اس کے لئے حضرت مولانا کو زیادہ مطالعہ، تازہ تحقیقات کی ضرورت تھی۔ جن عنوانات وموضوعات پر لکھنا تھا، وہ سب مستحضر تھے، ان کے جملہ

متعلقات ذہن میں تھے، اس لئے مقدمہ کی تالیف جلد ہی مکمل ہوگئی تھی، حواشی وافادات کا کام بہت طویل، دقّت طلب تھا، زیادہ اہتمام چاہتا تھا، اس میں ہراک موقع پرغور وفکر اور بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی، اس وجہ سے افادات وحواشی کی تالیف وتسوید کا عمل اور حواشی کی تحریر وتالیف کا سلسلہ، ترجمہ اور مقدمہ کی نسبت بہت سست رفتار تھا۔

حضرت مولانا کے مرتبہ افادات: ترجمہ پر حضرت مولانا کے افادات، جو سورۂ فاتحہ اور بقرہ سے شروع ہوئے تھے، سورۂ نساء کے آخر تک پہنچے تھے، کہ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ [جنوری ۱۹۲۰ء] میں، شیخ کی مالٹہ سے رہائی کے احکامات آ گئے، اس لئے سب کام اور سامان سمیٹ کر، وطن واپسی کی تیاری شروع ہوگئی تھی، مگر سفر ذرا دیر سے شروع ہوا، ۲۲/جمادی الاخریٰ ۱۳۳۸ھ [۱۲/مارچ ۱۹۲۰ء] کو مالٹہ سے چل کر ۲۰/رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ [جون ۱۹۲۰ء] میں، بمبئی کے ساحل پر اترے، ہندوستان میں بے شمار مصروفیات اور سیاسی تقاضے انتظار میں تھے، جس کے لئے مسلسل سفر گویا لابدی تھے، مالٹہ کا سفر اور اس کی مشکلات ہی کیا کم تھیں، کہ ان بے پناہ، نہ ختم ہونے والی مصروفیات نے، صحت کو اس لائق نہیں چھوڑا کہ یہ عالم جلیل خود کو علمی کاموں اور فوائد وترجمہ قرآن کے لئے فارغ کرسکتا۔ ان ہی مصروفیات میں تھے کہ مرض بڑھ گیا، یہی بیماری، مرض وفات ثابت ہوئی اور اسی میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، حواشی کی تالیف کا کام سورۂ نساء تک ہی پہنچا تھا، کہ لکھنے والے کی زندگی کا سفر پورا ہوگیا۔ للّٰہ مااعطی و له مأأخذ.

شیخ الہند کو ترجمۂ قرآن مجید اور اس کے افادات کا خاص خیال اور ان کی حفاظت کا اہتمام: حضرت شیخ الہند نے قرآن مجید کے اپنے ترجمہ اور حاشیوں وغیرہ کی حفاظت کا بہت اہتمام تھا، شیخ کی تمنا تھی کہ یہ محفوظ رہے اور قدردانوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔ حضرت مولانا کے اس جذبہ، اور ترجمۂ قرآن مجید کی حفاظت کی فکر کا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب مالٹہ سے، ہندوستان واپسی کے سفر میں، حضرت مولانا کا جہاز طوفان کی زد میں آ گیا تھا، اور اس کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگیا تھا، اس وقت شیخ الہند نے، مولانا عزیر گل صاحب کو ہدایت فرمائی تھی کہ تم تیرنا جانتے ہو، اگر خدا نہ کرے، جہاز ڈوب جائے، تو تم کوشش کرو کہ یہ ترجمہ محفوظ رہے۔[1]

(۱) ملاحظہ ہو: مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار۔ مولانا صوفی عبدالحمید صواتی۔ ص:۲۵۹ [گوجرنوالہ ـــــ ۱۴۱۱ھ]

یہ حواشی وافادات کہاں سے کہاں تک ہیں: جیسا کہ گزرا، حضرت مولانا نے سورۂ نساء کے آخر تک حاشیے اور توضیحات مکمل فرمالی تھیں، لیکن جب ان حواشی وافادات کی طباعت واشاعت کا موقع آیا، تو معلوم ہوا، حضرت مولانا کے کاغذات میں، سورۂ آل عمران کے حاشیے موجود نہیں ہیں اور حضرت مولانا کو ہندوستان واپسی کے بعد، اس قدر فرصت ہی نہیں ملی کہ مولانا خود اس پر توجہ فرماتے، یا حضرت سے ان حواشی کے متعلق زیادہ جستجو کی جاتی، یا اس کو مکمل فرماتے، اس لئے مدینہ پریس بجنور سے، ترجمہ کی پہلی طباعت کے ساتھ، سورۂ آل عمران پر، حضرت مولانا کے حاشیے شائع نہیں ہوئے تھے، یہ حاشیے اب تک بھی، ہنوز گم نام ونامعلوم ہیں۔ مولوی مجید حسن صاحب نے [ترجمۂ شیخ الہند کی، سب سے پہلی طباعت کے آغاز پر] گذارش طابع وناشر میں لکھا ہے کہ:

> ''مسودات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حواشی سورۂ آل عمران، جن کو مولانا، رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرما چکے تھے، ان میں موجود نہیں ہیں اور اتنی مہلت نہ ملی کہ بقیہ حواشی کی تکمیل کرائی جائے''۔[۱]

یہی وجہ ہے کہ سورۂ آل عمران کے حاشیوں پر، شیخ الہند کے افادات نہیں تھے، حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح قرآن سے لئے گئے ہیں، اس کی بھی مولوی مجید حسن نے وضاحت کی ہے۔ تحریر ہے:

> ''تمام بزرگوں سے مشورہ کرنے کے بعد، یہی رائے قرار پائی کہ باقی قرآن مجید میں، حضرت شاہ عبدالقادر کے حواشی درج کر دیئے جائیں، کیوں کہ اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا''۔

موجودہ حاشیوں کی ترتیب: اس لئے ترجمہ شیخ الہند کی سب سے پہلی طباعت [رجب ۱۳۴۴ھ/فروری ۱۹۲۶ء] سے، علامہ شبیر احمد کے مکمل حواشی سے مزین نسخہ کی اشاعت [طبع اول: جمادی الاول ۱۳۵۵ھ/اگست ۱۹۳۶ء] تک، ترجمہ شیخ الہند کی تمام اشاعتیں اسی ترتیب پر تھیں، کہ ان میں سورۂ فاتحہ وبقرہ اور سورۂ نساء کے افادات وحواشی شیخ الہند کے تھے اور آل عمران اور سورۂ نساء کے بعد سے، آخر قرآن تک جملہ حاشیے، حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح قرآن سے نقل کئے گئے تھے۔ جب علامہ شبیر احمد صاحب

(۱) تحریر مولوی مجید حسن بجنوری، بر طبع اول، عرض ناشر ص:......................

عثمانی کے حواشی مکمل ہوکر شائع ہو گئے، تو یہ ترتیب کچھ بدل گئی، اس ترجمہ کی ابتدائی اشاعتوں سورۂ آل عمران کے علاوہ، شیخ الہند کے افادات ہیں، سورۂ آل عمران پر شاہ عبدالقادر کی توضیحات ہیں اور سورۂ نساء کے بعد سے آخر تک کے حاشیے، علامہ کی یادگار ہیں۔

لیکن علامہ عثمانی کے حواشی کی اشاعت کے بعد، پڑھنے والوں کے پیہم اصرار پر، علامہ عثمانی نے ان سورتوں کے افادات وحاشیے بھی تحریر فرمادیئے تھے، جو شیخ الہند کے قلم فیض رقم سے نہیں تھے۔

اس طرح ترجمۂ شیخ الہند پر فوائد اور ان کی اشاعتیں تین طرح کی ہوگئی ہیں۔ سب سے پہلی اور اس کے قریب کی اشاعتیں، ان پر سورۂ بقرہ، نساء، سورۂ نساء کے بعد سے، آخر قرآن مجید تک، تمام حاشیے حضرت شاہ عبدالقادر کے ہیں، ۱۳۵۵ھ تک کی تمام اشاعتیں اسی ترتیب پر ہیں۔ ۱۳۵۵ھ میں سورۂ آل عمران کے افادات شاہ عبدالقادر کے اور سورۂ نساء کے بعد سے، آخر قرآن تک علامہ شبیر احمد عثمانی کے، اور تقریباً ۱۳۶۴ھ کے بعد، شاہ عبدالقادر کے افادات ختم ہو گئے، سورۂ فاتحہ وسورۂ نساء کے علاوہ، تمام حواشی وافادات علامہ شبیر احمد عثمانی کے قلم سے ہیں۔

یہ ترجمہ مکمل ہونے کی ہندوستان میں اطلاع، اس کی شہرت اور اس کا انتظار عام: شیخ الہند اور ان کے رفقائے کرام کی مالٹہ میں نظر بندی کی وجہ سے، پورے ہندوستان میں نہایت رنج وغم کا عالم اور خاص کیفیت تھی، ہندوستان کے جلیل القدر رہنما، علمائے کرام، سیاسی قائدین اور مختلف طبقوں کے ذمہ داران، اپنی اپنی حیثیت اور رسائی کے مطابق، شیخ الہند کی مالٹہ سے رہائی اور خیر وعافیت کے ساتھ، جلد سے جلد ہندوستان واپسی کے لئے، ہر قسم کی کوششیں اور متواتر جدوجہد کرتے رہے۔ ہندوستان کے دینی علمی حلقوں اور اخبارات ورسائل میں، شیخ الہند کی نظر بندی اور جلد رہائی کے لئے کوششوں کی خبریں گشت کرتی اور چھپتی رہتی تھیں، جس میں ضمناً شیخ کی صحت وعلالت، مصروفیات اور رفقائے اسیری کے احوال کا تذکرہ ہوتا تھا، اسی میں ترجمہ قرآن مجید کی تکمیل کی خوشخبری بھی نظر آجاتی تھی، اسی وجہ سے شیخ الہند کی ہندوستان واپسی کے اشتیاق کے ساتھ، ترجمہ قرآن مجید کی دید اور اس سے استفادہ کا بھی بیحد شوق تھا۔ جب شیخ الہند بمبئی کے ساحل پر جہاز سے اترے، اس وقت ملک کے سینکڑوں منتخب و

ممتاز، اصحاب وعلماء، استقبال وپیشوائی کے لئے حاضر تھے، جس میں اخبار مدینہ اور مدینہ پریس بجنور کے مالک، مولوی مجید حسن صاحب بھی شامل تھے۔ مولوی صاحب اس ترجمہ کے متعلق اچھی طرح جانتے تھے اور نہایت مشتاق اور آرزومند تھے کہ، یہ دُرِ بے بہا میرے ہاتھ آئے، مجھے اس کی اشاعت کی سعادت وتوفیق نصیب ہو اور یہ گراں بہا تحفہ میرے ذریعہ سے، ہندی ملت اسلامیہ کے لئے سرمایۂ بصیرت اور نور نظر بنے۔

مولوی مجید حسن صاحب کے پوتے، جناب منیر حسن صاحب کا کہنا ہے کہ[1] مولوی مجید حسن صاحب نے اسی وقت، اس ترجمہ کی اشاعت کے لئے شیخ الہند سے اپنی اس دلی تمنا کا اظہار اور ترجمہ کے حقوق حاصل کرنے اور اس کی طباعت کے درخواست پیش کر دی تھی، مگر ظاہر ہے کہ اس شدت جذبات اور ہجوم خلائق کے وقت، اس بات کو زیادہ آگے بڑھانے کا موقع نہیں تھا، دیوبند پہنچ کر، شیخ الہند بے پناہ مصروفیات میں گھر گئے تھے، زندگی کے آخری دنوں تک [ہندوستان میں قیام کی مدت کل چھے ماہ ہے] اس پر توجہ کا زیادہ موقع نہیں ملا، شیخ الہند کے شب وروز کے متواتر مشاغل، اور ملاقاتیں جاری تھیں کہ بیمار ہو گئے، مگر سخت بیماری، جسمانی انحطاط اور کمزوری کے باوجود، سفر اور ضروری معاملات پر توجہ فرماتے رہے، بالآخر اسی میں رحلت گرائے راہ آخرت ہو گئے، لیکن مولوی مجید حسن کی، ترجمہ شیخ الہند کو، اپنے مدینہ پریس سے، آب وتاب سے چھاپنے کی جو تمنا تھی، وہ برابر زندہ وتوانا رہی۔ مولوی صاحب اس کے لئے متواتر کوششیں کرتے رہے، بالآخر ۱۲/ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ [۲۸/جون ۱۹۲۳ء] کو، مولوی صاحب شیخ الہند کے وارثین سے معقول معاوضہ پر، اس کی اشاعت

(۱) میں جناب منیر حسن صاحب کا ممنون ہوں کہ جب میں مدنیہ بلڈنگ بجنور حاضر ہوا، تو موصوف نے بھرپور تعاون کیا، اس موضوع پر اپنی معلومات سے نوازا، حواشی علامہ عثمانی کے اصل مسودات کی زیارت کرائی، پہلی طباعت کی دید سے مسرور کیا اور کام ودہن کی ضیافت بھی فرمائی، دلی شکریہ! ـــــــ اس کے لئے موصوف کی مرحوم پھوپھی زاد بہن، محترمہ عابدہ سمیع الدین صاحبہ کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ایک علمی منصوبہ ''آزادی کی تحریک میں مسلمان عورتوں کا حصہ'' کی تحریر وتالیف کے لئے، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کے ذخیرہ سے استفادہ کے لئے، کاندھلہ آئی تھیں، دو تین روز ٹھہریں اور منیر صاحب سے رابطہ کر کے، ترجمہ شیخ الہند اور حواشی علامہ عثمانی سے استفادہ میں تعاون کی خاص ہدایت کی۔ جزاھما اللہ خیر الجزاء

کے دائمی حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور فوراً ہی اس دولت بے بہا کو عام کرنے اور اس کی اشاعت کے سروسامان میں لگ گئے تھے۔

مولوی مجید حسن صاحب اس ترجمہ کو، جس اعلیٰ معیار اور شایان شان طریقہ پر شائع کرنا چاہتے تھے، وہ بہت مشکل، دیر طلب، نہایت محنت کا اور جانگداز کام تھا، مگر مولوی صاحب کی بے پناہ لگن اور بلا تکلف کثیر خرچ نے، اس مشکل دیر طلب کام کو آسان کردیا۔ بہت بلند معیار، بے نظیر کتابت، اعلیٰ درجہ کے غیر ملکی کاغذ اور خوبصورت ترین طباعت سے منور وآراستہ ہوکر، یہ گراں قدر دلکش تحفہ، رجب ۱۳۴۴ھ [فروری ۱۹۲۶ء] میں مکمل ہوکر، پریس سے نکلا اور قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچا۔

پہلی طباعت، تعارف اور خصوصیات: ترجمہ شیخ الہند کی پہلی اشاعت، حسن کتابت، لوازم طباعت کی رعنائی، آرائش زیبائش کے علاوہ، اپنے اضافی مشتملات ومندرجات کی وجہ سے بھی، بعد کی تمام طباعتوں سے ممتاز ومنفرد ہے۔ اس میں کئی ایسی تحریریں اور خاص مضامین چھپے تھے، جو اپنی اہمیت کے باوجود، بعد کی طباعتوں میں شامل نہیں کئے گئے۔ چوں کہ اب اس طباعت کے نسخے کم یاب ہیں، اس لئے اس طباعت اور اس کے جملہ مندرجات کا، کسی قدر مفصل تعارف پیش ہے۔

دیدہ زیب سرورق: ہر اک کتاب دیکھنے پڑھنے والے کی، پہلی نظر اس کے سرورق [ٹائٹل] پر جاتی ہے، یہی بات اس اشاعت اور ترجمہ قرآن مجید کی بھی ہے، اس پر نگاہ جاتے ہی دیکھنے والا بے ساختہ سبحان اللہ! کہہ اٹھتا ہے۔ کیا دلکش، خوبصورت ٹائٹل ہے، جو اعلیٰ درجہ کے آرٹ پیپر پر چھپا ہے، خوشنما، خوش رنگ، بیل بوٹوں سے مزین، ایسا جاذب نظر ہے کہ دیکھتے ہی رہئے۔ اس کے بعد عام معمول کے مطابق اندرونی سرورق ہے، جو سادہ کاغذ پر ہے، تیسرا صفحہ مولوی مجید حسن کی قلم سے نوائے حمد سے لبریز ہے، اس صفحہ کی کتابت وطباعت اور نوائے حمد کے الفاظ، ایک ادبی تحفہ اور یادگار تحریر ہیں، کاش یہاں اس کو جوں کا توں پیش کیا جاسکتا، نقل میں وہ بات اور تأثر پیدا نہیں ہوسکتا، جو اصل کے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ یہ حمد، اس کے الفاظ اور اس کی کتابت، آج بھی اسی طرح زندہ اور تر وتازہ معلوم ہوتی ہے، جیسی پہلی اشاعت کے وقت تھی......ملاحظہ ہو:

نوائے حمد

پاک ہے وہ ذات حیّ وقیوم، جس کی عمیم الاحسانی نے ایک بندۂ خاطی وعاصی کو نوازا اور اپنے فیوض بے پایاں وانعاماتِ بے کراں سے بہرہ اندوز فرمایا۔ یہ گدائے تہی دامن، اپنے ربّ قدوس کی بارگاہِ اعلیٰ میں، ہزار در ہزار ارمغان تشکر ومنت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے، جس نے محض اپنی توفیق نامتناہی سے، ایسے کارِ عظیم کو حسنِ انجام عطا فرمایا۔

یارائے زباں کو کہ ثنائے تو کنم توصیف کمالِ کبریائی تو کنم
چیزے بہ بساط من تہی دامن نیست جانے کہ تو دادۂ فدائے تو کنم

شعبان المعظم ۱۳۴۴ھ ہجری۔ محمد مجید حسن غفرلہ

اس کے بعد، طابع وناشر کی جانب سے ایک مفصل گذارش ہے، جس میں اس اشاعت کی کچھ تاریخ اور اس طباعت کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، یہ پوری تحریر لائق مطالعہ ہے۔

ترجمہ شیخ الہند ممتاز علماء، اور اہل نظر کی نگاہ میں: اس کے اختتام پر، ترجمہ شیخ الہند کے متعلق ممتاز علماء کی رائے اور تأثرات نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مولوی مجید حسن نے مکمل ترجمہ کی طباعت سے پہلے، اس ترجمہ اور افادات شیخ الہند پر مشتمل دو پارے، نمونہ کے طور پر چھپوا کر، اس وقت کے ممتاز ترین علماء، فاضل اور اہل قلم کو، ملاحظہ وتبصرہ کے لئے بھیج دیئے تھے۔

ان حضرات کے جو جوابات یا تحریریں موصول ہوئیں، وہ اس عنوان کے تحت، درجہ بدرجہ شامل ہیں، سب سے پہلے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (انبیٹھوی، مہاجر مدنی، مصنف بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد) کی رائے درج کی گئی ہے، دوسرا گرامی نامہ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے، جو کامل اختصار کے باوجود، اپنے آپ میں ایک مکمل تبصرہ ہے۔ نیز علامہ شبیر احمد عثمانی کا تأثر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی تحریر شامل ہے، [رحمہم اللہ] مولانا خواجہ عبدالحی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا نصر اللہ خاں صاحب، معاون مدیر مدینہ اخبار وغیرہ کی رائیں بھی درج ہیں۔

تقریظات وتبصروں کا سلسلہ پورا ہوکر، مقدمہ ترجمہ قرآن مجید شروع ہوا ہے، یہ مقدمہ پہلی طباعت میں ص:۵ سے ص:۱۲ تک آیا ہے۔

اس کے بعد تین صفحات [۱۳-۱۴-۱۵] پر مختصر فہرست مضامین قرآن مجید ہے، اسی پر یہ سلسلہ افادات ومضامین ختم ہوگیا ہے۔ اس کے بعد ایک سلسلہ صفحات ومضامین اور ہے، اس کی ابتداء شیخ الہند کے حالات پر، حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی تحریر سے ہوتی ہے، اس تحریر میں مولانا مدنی نے، شیخ کی زندگی کے کچھ ایسے گوشوں کا ذکر کیا ہے، جس کا شیخ الہند پر کسی بھی تحریر وتالیف، بلکہ خود مولانا مدنی کی اور تحریرات میں بھی، تذکرہ نہیں ہے۔ ص:۳،۴ پر بدرالحسن جلالی صاحب [معاون مدیر اور مہتمم مدینہ پریس بجنور] کے قلم سے: عرض نیاز بدر ہے، اسی کے آخری حصہ میں، ترجمۂ شیخ الہند کی تاریخ طباعت پر قطعات تاریخ نقل کئے گئے ہیں۔ سب سے آخری صفحہ پر، حقوق اشاعت محفوظ ہونے کا اعلان ہے۔

اس ترجمہ وطباعت کے تعارف کے لئے، مولوی مجید حسن کا ایک مفصل اشتہار: مولوی مجید حسن نے اس طباعت کا آغاز ہوتے ہی، ترجمہ شیخ الہند کے اس نسخہ کے تعارف پر، ایک بڑا اور خاصا مفصل اشتہار، اپنے اخبار مدینہ بجنور کے ۱۳؍اگست ۱۹۲۳ء [۲۹؍ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ] کے ضمیمہ کے طور پر، علیحدہ شائع کیا تھا۔ یہ اشتہار دو بڑے صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ایک جانب، ترجمہ شیخ الہند کی پہلی طباعت کی، اصل اشاعت کی پیمائش کے مطابق، سورۂ بقرہ کی چند آیات کا ترجمہ اور حاشیہ پر اس کے فوائد، اصل تحریر وکتابت میں دیئے گئے ہیں، یہ پہلی طباعت کے صفحہ:۶۵ کا عکس ہے۔ دوسرے صفحہ پر ''مژدۂ عظیم وبشارت عمیم'' کے عنوان سے مفصل تحریر ہے، اس تحریر سے اس ترجمہ کے لئے، شیخ الہند کے فکر واہتمام اور بعض ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے، جس کا کہیں اور تذکرہ نہیں آیا۔ اس لئے یہ پورا اشتہار یہاں نقل کیا جاتا ہے:

بندگان اسلام وغلامانِ محمدی کے لیے
مژدۂ عظیم وبشارت عمیم

رنگہا در طبع اربابِ صفا آمیختہ　　نکتہ ہا درخاطر اہل بیاں انداختہ
آنچناں شمع براہ کج رواں افروختہ　　ایں چنیں گنجے، بجیب مفلساں انداختہ

یعنی

شیخ المشائخ، قطب الاقطاب، راس المحدثین، زبدۃ المفسرین، حضرت شیخ الہند

مولانا وسیدنا **محمود حسن** نور اللہ مرقدہ کا، مقدس ومطہر

اردو ترجمہ قرآن مجید، موسومہ بہ موضح فرقان

جس کے دس پاروں کا ترجمہ، مولانا مرحوم وطن شریف (دیوبند) میں فرما چکے تھے، اس کے بعد حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے، مولانا کئی صندوق کتابوں کے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ چنانچہ باقی بیس پاروں کا ترجمہ، حضرتؒ نے بحالت اسیری جزیرہ مالٹا میں مکمل فرمایا، ان آخری بیس پاروں کی عربی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی [کی یادگار ہے] اور ترجمہ حضرتؒ کے مبارک قلم کا لکھا ہوا ہے، اس مقدس خدمت کے اندر، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، مولانا محمد مبین صاحب اور مولانا عزیر گل صاحب کے مبارک ہاتھ بھی شامل ہیں۔

عنقریب نہایت آب وتاب، صحت کاملہ وکتابت نادرہ

کے ساتھ دفتر اخبار مدینہ، بجنور، یوپی سے شائع ہونے والا ہے۔ اس مقدس ترجمہ کی بنیاد جس حسن انتظام وخوبی اہتمام، جانفشانی پیہم وعرق ریزی مسلسل سے، حضرت مولانا ممدوح نے فرمائی ہے، وہ ہندوستان بھر میں، ایسے عظیم الشان مقصد کی، تکمیل حسنہ کی، بے نظیر مثال ہے۔

قرآن کریم کے تمام موجودہ معتبر وغیر معتبر اردو فارسی ترجمے، معہ تفاسیر مختلفہ متداولہ وغیر متداولہ کے، پیش نظر رکھ کر، عالی استعداد اور ذی علم طلبا کو شریک کار بنایا، عربی دواوین وکتب ادبیات کی امداد واعانت لے کر، اردو کی سلاست وبامحاورگی کو اردو لغات سے مستند کیا، علمائے متبحر اس بحث میں شریک ہوتے، حضرت شاہ عبدالقادر قدس سرہ کے اردو ترجمہ پر مبسوط بحث فرما کر، اپنا قول فیصل دیتے اور پھر ترجمہ ثبت فرماتے۔ صحیح معنٰی میں یہ موضح فرقان، حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کی ترمیم ہے، جو حسن بر بالائے حسن کا مصداق ہے، حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ اور پھر مولانا کی ترمیم، سبحان اللہ!

آج یہ بندۂ ناچیز، عبدخاطی، خادم قوم وملت، فقیر مجید حسن، مالک اخبار مدینہ، جمیع برادران اسلام کی خدمت میں، اس نعمت عظمیٰ ودولت کبریٰ کا اصلی **نمونہ رنگین**، پیش کرنے کی سعادت وعزت حاصل کرتا ہے۔ نمونہ جملہ کیفیات، مثلاً تقطیع وکاغذ، کتابت وطباعت کی ایک تشریح ہے۔ رنگ پختہ اور چھاپہ کا ہے نہ کہ دستی، جیسا کہ عموماً قاعدہ ہے، گویا کل موضح فرقان دومرتبہ چھپے گا، ایک مرتبہ رنگین روشنائی سے اور دوسری مرتبہ سیاہ روشنائی سے۔ اس ترجمہ کے تمام حقوق تالیف واشاعت، حضرت نوراللہ مرقدہ کی صاحبزادیوں اور برادران محترم نے، حسب قانون مروجہ باضابطہ بیع ہونے کے بعد، میرے نام محفوظ فرمادیے ہیں۔

نمونہ خدمت میں ارسال ہے

ہدیہ مجلد: پندرہ روپیہ۔ جوکرم فرما پیشگی قیمت ادا فرمائیں گے، ان سے دس روپیہ ہدیہ لیا جائے گا۔ یہ سہولت ان برادران اسلام کے لئے رکھی گئی ہے، جن کے شوق بے پایاں نے، ابھی سے طلب صادق کا اظہار شروع کردیا ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق، فوراً ہدیہ پیشگی روانہ فرماکر، اپنا اسم گرامی درج رجسٹر فرمائیں گے۔

المشتہر: خاکسار مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور، (یوپی)

فوائد موضح فرقان: حضرت شیخ الہند نے حضرت شاہ عبدالقادر کی پیروی میں، ترجمہ شاہ عبدالقادر کی توضیح وتسہیل کے بعد، حضرت شاہ کے فوائد کے طرز پر، پورے ترجمہ پر مفصل افادات فوائد لکھنے کا بھی فیصلہ کرلیا تھا، مالٹا میں ترجمہ قرآن مجید اور نظر ثانی کا عمل پورا ہونے کے بعد، افادات لکھنے شروع کردیئے تھے۔ شیخ نے ان افادات کا کیوں ارادہ کیا، اس کے کیا مقاصد تھے، ان میں شیخ الہند کیا پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس کی شیخ الہند نے ان الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے:

> فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ موضح قرآن کے جملہ فوائد کے لینے کا التزام کیا گیا ہے، مگر شاذ ونادر کہ کسی وجہ سے اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی اور فوائد میں، چونکہ ہر طرح سے گنجائش اور وسعت ہے، ترجمہ کی طرح قید اور تنگی نہیں، تو اس لئے ہم نے اکثر یہ

کیا ہے کہ حضرت ممدوح کے فوائد کو اپنی عبارت میں بیان کیا ہے اور تقدیم وتاخیر تغیر وتبدل، اجمال وتفصیل وغیرہ امور سے احتراز نہیں کیا اور بہت سے فوائد بالاستقلال مفید اور نافع سمجھ کر، مختلف موقعوں سے لے کر، اپنی رائے سے بڑھادیے ہیں، اور حضرت شاہ صاحب کی تقلید کی وجہ سے، ترجمہ میں اگر کسی جگہ قدرے تنگی رہ گئی، تو اس کے بدلے میں، مکافات سے بھی زائد فوائد میں، اس کو واضح کر دیا گیا ہے، اور بغرض تشریح وتسہیل وتکمیل فوائد کی تکثیر کو، ہم نے اختیار کیا، فوائد میں طول ہوجانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ جو کوئی مترجم فوائد لکھتا ہے، وہ صرف کلام مجید کے متعلق لکھتا ہے اور احقر کو اس کے علاوہ، حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کے متعلق بھی، بعض مواقع میں کچھ کچھ عرض کرنے کی نوبت آتی ہے۔

کیونکہ ہماری تمام سعی کا لب لباب، دراصل ترجمہ موصوف کی خدمت گذاری ہے وبس! چونکہ بعض بعض مقامات پر کچھ کچھ ترمیم کرنے سے، حقیقت میں یہ دوسرا ترجمہ نہیں ہوگیا، اس لئے اس کا کوئی نام، مستقل مقرر کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا، مگر صرف دفع التباس اور رفع اشتباہ کی مصلحت سے، مناسب معلوم ہوا کہ اگر اصل ترجمہ کے نام کے علاوہ، اس کا بھی کچھ نام رکھ دیا جاوے، تو التباس واشتباہ سے پورا بچاؤ رہے گا"۔

گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ، شیخ نے ترجمہ مکمل کرنے کے بعد، حواشی وافادات کی تحریر پر توجہ فرمائی تھی، افادات کی تحریر سورۂ نساء تک پہنچی تھی، کہ مالٹہ سے رہائی کے احکامات آ گئے، کیوں کہ واپسی کے جہاز کی تاریخ کی اطلاع آ سکتی تھی، اس لئے تمام علمی تصنیفی مشغلہ ختم ہوا، سامان باندھ لیا گیا تھا، مگر سفر میں کسی قدر دیر ہوگئی، ۲۲/ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ [۱۲/ مارچ ۱۹۲۰ء] کو مالٹہ سے واپسی کے سفر کا آغاز ہوا۔

ہندوستان پہنچنے پر، پورا ملک حضرت شیخ الہند کے انتظار میں چشم براہ تھا، حضرت مولانا، جو سراپا جہد وعمل تھے، اپنی پرانی خدمات میں منہمک ہوگئے تھے۔ تحریک خلافت اور ملی سیاسی جدوجہد کی وجہ سے، ملک میں جوش وخروش تھا اور بے شمار موقعوں پر جانے، اور رہنمائی کرنے کی ضرورت تھی۔ شیخ الہند نے ہر اک پر توجہ فرمائی، بالآخر اسی مسلسل مصروفیت کے ہجوم میں بیمار پڑ گئے اور اسی میں وفات ہوگئی، اس لئے

یہ افادات سورۂ نساء سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اشاعت کے لئے تیاری کے وقت جو حواشی کو دیکھا گیا، تو واضح ہوا کہ شیخ الہند کے لکھے ہوئے، سورۂ آل عمران کے حاشیے، ان کے کاغذات میں جو [ترجمہ قرآن کریم کے مسودات اور مقدمہ وغیرہ کے ساتھ] شیخ الہند کے ورثاء سے، مولوی مجید حسن صاحب کو ملے تھے، موجود نہیں تھے۔ مولوی صاحب، ترجمۂ شیخ الہند کے ساتھ، تمام حواشی وافادات کی اشاعت کا اعلان کر چکے تھے، قارئین کو دونوں کا شدت سے انتظار تھا، اس لئے ناتمام افادات ہی چھاپنے کا فیصلہ کرلیا اور سورۂ آل عمران کے جو حاشیے دستیاب نہیں تھے، ان کی جگہ افادات شاہ عبدالقادر درج کر دیئے گئے، سورۂ نساء کی بعد کے افادات اور حواشی، جس کے لکھنے کا شیخ الہند کو موقع ہی نہیں ملا تھا، ان کی کمی بھی شاہ عبدالقادر کے افادات سے پُر کی گئی۔ یعنی ترجمہ شیخ الہند کی سب سے پہلی اشاعت [۱۳۴۴ھ] میں، صرف سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ سورۂ نساء پر، شیخ الہند کے افادات تھے اور تمام سورتوں کے حاشیے اور افادات موضح قرآن، شاہ عبدالقادر سے لئے گئے تھے۔

ترجمۂ شیخ الہند کی کتابت کے لئے کاتبوں کا انتخاب: اس ترجمہ کو عمدہ طباعت سے آراستہ کرنے کے لئے پہلا مرحلہ، متن کی اور ترجمہ کی نفیس کتابت کا تھا، متن کی کتابت کے لئے اس وقت کے ایک بلند پایہ خوش نویس، منشی محمد قاسم لدھیانوی کی خدمات حاصل کی گئیں، جو خط نسخ اور قرآن کریم کے مشہور کاتب تھے اور مایۂ ناز خطاط شمار کئے جاتے تھے۔ حواشی کی کتابت کے لئے، نستعلیق کے ایک اور باکمال مشہور کاتب منشی عبدالقیوم[۱] مرادآبادی کا انتخاب ہوا، منشی عبدالقیوم بھی اپنے فن میں یکتا تھے۔ کاتبوں کے قران السعدین کے اجتماع کے بعد، ترجمۂ شیخ الہند کی کتابت کا آغاز ہوا، متعدد علماء، جید حافظوں کی ایک جماعت، کتابت کا مقابلہ اور اس خطاطی کی نگرانی کے لئے مقرر تھی، مولوی مجید حسن بھی نہایت مصروفیت کے باوجود، تصحیح کے کام میں خود شریک رہتے تھے، اس طرح فاضلین وکاملین کی ایک جماعت کی کوششوں سے، اس دُرِ یکتا کی اشاعت کے لئے کتابت وتحریر مکمل ہوئی۔

چوں کہ مولوی مجید حسن ترجمۂ شیخ الہند کی طباعت، عام معیار طباعت سے بہت ممتاز اور نمایاں چاہتے تھے، اس لئے پتھر کی سادہ چھپائی کو نظر انداز کر کے، پورے قرآن مجید کے متن اور ترجمہ کی طباعت کے

(۱) منشی عبدالقیوم کا ہندوستان کے بڑے خطاطوں میں شمار ہوتا تھا، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی [جو کتابت وتحریر میں نہایت باریک بیں اور صاحب نظر تھے] اپنی تفسیر: ترجمان القرآن کی کتابت کے لئے، منشی عبدالقیوم صاحب کو، خاصی چھان بین کے بعد منتخب کیا تھا، منشی عبدالقیوم، مولوی عبدالملک جامعی، مہاجر مدنی کے والد تھے۔

لئے، بلاک بنوائے گئے۔مولوی مجید حسن صاحب نے اس کا پہلا ایڈیشن، بڑے اہتمامات وتکلفات کے ساتھ،قرآن مجید کے عام اور مقبول سائز سے، بڑے سائز پر، بڑی تعداد میں چھپوایا تھا،جس پر خرچہ بھی عام کتابوں اور طباعتوں سے بہت زیادہ ہوا تھا اور اس کی قیمت بھی،اگر چہ لاگت سے ذرا زیادہ،صرف پندرہ روپئے رکھی گئی تھی،مگر پھر بھی یہ قیمت،اس وقت کی قیمتوں کے لحاظ سے،بہت زیادہ تھی[اگر اس ترجمہ کو،اسی شان آن بان سے،اسی پیائش کے عمدہ کاغذ پر چھاپا جائے تو فی نسخہ لاگت ہزار بارہ سو روپئے سے کم نہ ہوگی] بہرحال یہ ترجمہ چھپا،غلغلہ اس کا پہلے سے برپا تھا، چھپتے ہی تبرک کی طرح، ہاتھوں ہاتھوں نکل گیا، ناشر کو فوراً ہی دوسری، پھر تیسری اشاعت کی ضرورت ہوئی۔اس مقبولیت اور پذیرائی کی وجہ سے مولوی مجید حسن صاحب کے دل کی کلی کھل گئی، انہوں نے اس ترجمہ کو پڑھنے والوں کی،عمر،بصارت کی سہولت اور قوت خرید کا خیال رکھتے ہوئے، بڑی پیائش سے حمائل تک، پانچ سائزوں میں،علیحدہ علیحدہ چھاپنے کا انتظام کرلیا۔جس سے اس کی مقبولیت وپذیرائی،کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

اس کے بعد یہ رائے ہوئی کہ ہراک کے لئے، یکساں اعلیٰ معیار کا اور بھاری قیمت کا قرآن مجید خریدنا آسان نہیں ہے،اس لئے اول پانچ میں سے، ہراک طباعت کو دو قسم پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔جس کو بعد میں اور وسیع کر کے، تین طرح کی طباعت کا معمول ہو گیا تھا، ہراک سائز کی طباعت کے تین نسخے ہوتے تھے،اعلیٰ ترین،اوسط اور سادہ معمولی،اس تقسیم وترتیب اور تجارت وفروخت کے تیز رفتار،انتظامات کی وجہ سے، یہ ترجمہ،اشاعت وپذیرائی میں اونچی سے اونچی اڑان بھرتا چلا گیا۔

مولوی مجید حسن صاحب کے پوتے،مکرمی منیر حسن صاحب نے بتایا، کہ مولوی مجید حسن صاحب نے، ترجمہ شیخ الہند کی طباعت کے لئے، مدینہ پریس کا سب سے عمدہ حصہ اور اعلی ترین پریس علیحدہ کر دیئے تھے،ان پر سنہ ۱۹۴۷ء تک ترجمہ شیخ الہند کے علاوہ کچھ نہیں چھپا،سال کے بارہ مہینہ،اس پر ترجمہ شیخ الہند کی طباعت جاری رہتی تھی، ہراک سائز اور ہراک اعلیٰ، درمیانی اور عام نسخہ، ایک مرتبہ میں، پانچ ہزار چھپتا تھا،ابھی اس کی طباعت کا کام ختم نہیں ہوتا تھا، کہ دوسری قسم کی طباعت کی ضرورت سامنے آجاتی تھی، وہ ختم ہوتا تو کسی اور کا نمبر لگ جاتا ،اس طرح پریس کا ایک اعلیٰ ترین بڑا حصہ، پورے سال اسی بابرکت خدمت میں مشغول رہتا تھا۔منیر صاحب کی روایت ہے، کہ مولوی مجید حسن

صاحب نے یہ بھی طے کر رکھا تھا، کہ ہر قسم کی طباعت کے، ایک ساتھ پانچ ہزار نسخے چھپیں گے، ہمیشہ اسی پر عمل ہوا اور ہمیشہ طباعت اور پذیرائی کا یہ عمل جاری رہا۔ **فجزاہ اللّٰہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء.**

مولوی مجید حسن کا شیخ الہند کے نہج پر، تمام قرآن شریف کے فوائد لکھوانے کا فیصلہ، اس کے لئے متعدد علماء سے رابطہ اور اس راہ کی مشکلات:

پچھلے صفحات میں گزر گیا ہے، کہ شیخ الہند نے، اس ترجمہ پر جو فوائد وافادات لکھنے شروع کئے تھے، وہ سورۂ نسا تک پہنچ کر رہ گئے تھے، شیخ کو ان کو پورا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی، اس لئے جب مولوی مجید حسن نے اس کو پہلی مرتبہ شائع کیا، تو جو حصہ نا تمام تھا، اس پر شیخ الہند کے حواشی وافادات نہیں تھے، اس کو حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے افادات سے پر کر دیا تھا۔ اس نسخہ اور افادات شیخ الہند کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور محسوس ہوا کہ سورۂ نساء کے بعد، حضرت شاہ عبدالقادر کے افادات درج کر دینا کافی نہیں ہے، اہل علم، اہل ذوق کی طلب کچھ اور ہے، وہ شیخ الہند کے اصول وترتیب پر، تمام قرآن مجید کے مطابق، نئے حواشی اور افادات پڑھنا چاہتے ہیں، لہٰذا مولوی مجید حسن نے اسی نہج پر، تمام قرآن مجید کے فوائد لکھوانے کا ارادہ کر لیا۔ مولوی مجید حسن نے اعلان کیا کہ:

> ''اب عزم مصمم ہے کہ ان شاء اللہ بقیہ حواشی بھی، اس تفصیل وخصوصیت کے ساتھ، جسے مولانا نے ملحوظ رکھا ہے، کسی معتبر عالم اور دوسرے علماء کے مشورہ سے پورا کرا کے، اشاعت آئندہ میں درج کر دیئے جائیں۔''[1]

علوم قرآنی کی شرح وترجمانی میں، علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ الہند کے ثنی اور نمائندہ ولسان تھے، اس لئے شیخ الہند کی فکر، اسلوب، جامعیت اور تاثیر وقرآن فہمی، ہر اک کی اسی نہج پر اور دریا بہ کوزہ کے طریقہ کو چراغ راہ بنا کر، کام کرنے کے لئے، مولوی مجید حسن کا، علامہ شبیر احمد سے رابطہ، گویا فطری انتخاب اور حق کو، حق دار کے حوالہ کرنے کا اعلان تھا۔ مولوی صاحب نے اس خدمت یا شیخ الہند کے مرتبہ، نامکمل حواشی اور افادات کو پایہ تکمیل تک پہنچا دینے کے لئے، علامہ سے خط وکتابت اور ملاقاتیں کیں اور یہ حواشی لکھ دینے، مکمل

(۱) تمہید مرتبہ مولوی مجید حسن صاحب [طبع اول، بجنور ۱۳۴۴ھ]

کرنے کی درخواست کی، مگر علامہ، خاصی کوشش کے باوجود، اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، معذرت فرمادی۔

مولانا حسین احمد مدنی سے حواشی لکھوانے کا خیال اور اس میں ناکامی: مولوی مجید حسن نے دوسری کوشش کے طور پر، حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے سلسلہ جُنبانی کی، مولانا اس کے لئے تیار ہو گئے، اس خدمت کا معاوضہ اور معاونین کے لئے، تنخواہ وغیرہ کے معاملات بھی طے ہو گئے تھے۔ حضرت مولانا مدنی نے، حضرت شیخ کے افادات کی تکمیل کی سعادت حاصل کرنے کے لئے، مولوی مجید حسن کے اصرار اور فرطِ تعلق کی وجہ سے، اس کا ارادہ فرمالیا تھا، مولوی مجید حسن نے، اس کے لئے حضرت مولانا کے، ایک معاون و مددگار کو، دوسو روپے مہینہ، یا فی سیپارہ معاوضہ بھی دینا شروع کر دیا تھا، لیکن حضرت مولانا مدنی، مسلسل سفروں، دینی علمی سماجی، اصلاحی، سیاسی، مصروفیات میں، ہمہ وقت گھرے رہنے کی وجہ سے، چاہتے ہوئے بھی اس پر، پوری توجہ نہ فرما سکے۔ دوسال میں، ایک پارہ کے حواشی اور افادات مکمل کرنے کا بھی، موقع نہ ملا، تو مولانا مدنی نے اس خدمت سے معذرت چاہ لی اور جو معاوضہ طے ہوا تھا، وہ جوں کا توں واپس کر دیا۔[1]

(۱) پاکستان میں ترجمہ شیخ الہند کے سلسلہ میں شائع بعض تحریرات میں، ایک صاحب نے لکھا ہے کہ، حضرت مولانا مدنی کے حواشی بہت فاضلانہ اور عالمانہ تھے، اس لئے ان سے معاملہ ختم کر کے، دوبارہ مولانا شبیر احمد عثمانی سے کم درجہ کے [گویا معمولی اور عامیانہ] حواشی لکھوائے گئے، یہ الفاظ کس درجہ تعصب اور بدنیتی پر مبنی ہیں کہنے کی ضرورت نہیں! ان کلمات سے لکھنے والے کے جہل، علم سے دوری اور قرآن کے ترجموں اور حاشیوں اور حل مطالب سے بے خبری کا صاف پتہ چل رہا ہے۔

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہوشیار باش　　　اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ، ہوشیار باش

جو عقلمند ان حاشیوں کو، کم درجہ کا یا عامیانہ لکھ رہے ہیں، ان کو شاید قرآن فہمی اور مطالب قرآن مجید سے ذرا بھی تعلق نہیں، علامہ عثمانی کے حواشی کے لئے، اہل علم اہل نظر کی رائے تو یہ ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی نے، ان حاشیوں میں قرآن فہمی کا بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے، اور مختلف موقعوں پر عقلی کلامی سوالات کے جوابات، اس خوبصورتی جامعیت گہرائی اور وسعت نظر سے تحریر کئے ہیں، کہ ان پر اضافہ ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے۔

علامہ عثمانی کی قرآنی بصیرت، اللہ! اللہ! پھر اس گہرے عالمانہ، وسیع مطالعہ کو اپنی نہایت اونچی علمی سطح سے اتر کر، اپنے علم کو اردو کے سادہ الفاظ میں پرونا اور پیش کر دینا، قرآن مجید کا ایک اعجاز ہی کہا جا سکتا ہے، تعصب، غلو، کم علمی اور جہل کا برا ہو کہ وہ ہر جگہ اپنی بے بصیرتی کا کچھ نہ کچھ اظہار ضرور کرتا ہے، اور اپنی محدود فکر کے اثرات ضرور نقش کر دیتا ہے۔

حاشیہ ترجمہ شیخ الہند کی خدمت کے لئے آمادگی، اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس سے متوقع معقول آمدنی سے دست برداری کا حضرت مولانا مدنی نے بھی، اپنی ایک تحریر میں تذکرہ کیا ہے۔لکھا ہے:

''میرے لئے فوائد ترجمہ قرآنی کے لکھنے پر، معتدبہ تنخواہ موجود ہے'' [۱]

مولانا عبدالرحمٰن صدیقی امروہوی سے تحریر حواشی کیلئے رابطہ اوراس کا انجام: جب شیخ الہند کے بڑے علمی نمائندوں اور گویا جانشینوں، حضرت مولانا مدنی اور علامہ عثمانی سے، ناامیدی ہوگئی، تو مولوی مجید حسن صاحب کی، اسی کاروانِ علم کے ایک اور بڑے شہ شہوار، مولانا عبدالرحمٰن صدیقی امروہوی پر[جو حضرت مولانا احمد حسن امروہوی کے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ تھے]نظر گئی۔

مولانا عبدالرحمٰن امروہوی، بعض شرائط کے ساتھ، اس کے لئے تیار ہو گئے تھے، کام شروع ہو گیا تھا، لیکن مولانا امروہوی اچانک اس سے رک گئے، علیحدہ ہو گئے تھے۔مولوی مجید حسن کے اصرار، وضاحتوں اور معاملہ کی صفائی کے باوجود، کسی طرح بھی آگے بڑھنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔اس وقت مولوی مجید حسن صاحب نے مولانا امروہوی کو ایک مفصل خط لکھا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے لئے مسلسل سرگرم تھے، اور ایسی سازشیں اور کوششیں کر رہے تھے، کہ مولوی مجید حسن صاحب کا، ترجمہ شیخ الہند مکمل کرانے کا منصوبہ پورا نہ ہو اور اس کے لئے، جن علماء سے رابطہ کیا گیا ہے، وہ اس معاملہ اور افادات کی تحریر وتالیف سے الگ ہو جائیں۔خود مولوی مجید حسن صاحب نے اپنے ایک خط میں، اس سازش اور مخالفین کی اس کوشش کا، اس طرح اظہار کیا ہے:

''مولانا! دراندازوں کا حال، مجھے اچھی طرح معلوم ہے، مولانا حسین احمد کے فوائد لکھنے میں بھی، لوگ مزاحم ہوئے، اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر بھی، اثر ڈالا جارہا ہے'' [۲]

(۱) اخلاق حسینی، مرتبہ مولانا محمود بایزید افریقی ص:۹۳، [نعیمیہ، دیوبند، بلاسنہ]

(۲) مکتوب بنام مولانا عبدالرحمٰن صدیقی امروہوی، محررہ ۲۷/ جولائی ۱۹۲۸ء[۹/صفر ۱۳۱۷ھ] مشمولہ، تذکرہ شیخ الہند، تالیف: مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری ص:۱۳۱، تا ص:۱۳۵۔ مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری [کراچی: ۱۴۲۸ھ۔۲۰۰۷ء]

علامہ عثمانی سے تحریر حواشی کے لئے مکرر درخواست اور اس کی پذیرائی: مولوی مجید حسن نے، مولانا عبدالرحمٰن کی غلط فہمی دور کرنے کی خاصی کوشش کی، مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے، بات وہیں کی وہیں رہی، آگے بڑھنے کی صورت نہ بنی، اس لئے ہر طرف سے گویا مایوس ہوکر، ایک مرتبہ پھر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی سے گذارش کی گئی، حضرت علامہ نے اس وقت اس کو قبول فرمالیا اور حضرت شیخ الہند کے طریقہ پر، صرف اجر آخرت کے لئے تفسیری افادات کا سلسلہ، بلا معاوضہ مکمل کرنا طے کرلیا، لیکن اپنے دو معاونین کے لئے، ایک ایک سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کرادی، جو افادات کا مسودہ صاف کرتے اور مراجعت کا کام کرتے تھے۔ معاملہ طے ہوگیا، تو حضرت مولانا عثمانی نے، سورۂ نسا سے افادات وحواشی تحریر فرمانے شروع کئے، یہ کام اس برق رفتاری سے آگے بڑھا، کہ مولوی مجید حسن بھی حیران رہ گئے۔ ہر مہینہ میں ایک پارہ کے افادات وحواشی مکمل ہوجاتے، جو مولوی مجید حسن کو بھیج دیئے جاتے تھے، اس طرح بہت کم وقت میں یہ گراں قدر، بے نظیر سرمایہ، مرتب ومکمل ہوگیا، جس سے اردو جاننے پڑھنے والوں کے لئے، قرآن فہمی کا ایک نیا باب کھل گیا۔ ان افادات اور حاشیوں کا بھی اسی زور وشور سے استقبال ہوا۔ کثرت سے چھپا، فروخت ہوا اور پڑھا گیا، قرآن مجید کے اردو ترجموں کی طباعت کی تاریخ میں غالباً اس کی کوئی مثال نہیں۔

مقدمہ، ترجمۂ قرآن مجید

شیخ الہند کی خدمت قرآن کا تیسرا عنوان، اس ترجمہ اور شیخ الہند کے مرتبہ افادات قرآنی کا مقدمہ ہے، مگر اس کا معاملہ اتنا سادہ اور بے غبار نہیں ہے۔ مقدمۂ ترجمہ قرآن مجید پر، کئی پہلوؤں سے، گفتگو کی گنجائش ہے۔

اس بحث وگفتگو کا یہاں سے آغاز ہوتا ہے، کہ ترجمۂ شیخ الہند اور افادات ترجمۂ شیخ الہند، دونوں ایک ساتھ چھپے تھے اور اس وقت سے آج تک، ان کی کوئی اور، روایت یا اشاعت سامنے نہیں آئی، جس سے ان کی اصلیت واستناد کے متعلق، کچھ شک یا سوال پیدا ہوتا ہو، لیکن مقدمہ ترجمۂ شیخ الہند کا معاملہ، ایسا واضح اور صاف نہیں ہے۔

افادات اگرچہ ناتمام تھے مگر وہ اور ترجمہ شیخ الہند مکمل طور پر، ایک ساتھ چھپے تھے، ان کا نسخۂ مصنف، یا مسودہ، اس کے سب سے پہلے ناشر، مولوی مجید حسن کے سامنے، مدینہ پریس بجنور میں موجود تھا جس کا بڑا حصہ اب بھی محفوظ ہے، لیکن مقدمۂ ترجمۂ قرآن کی بات ایسی نہیں ہے۔ یہ مقدمہ، شیخ الہند کی حیات میں، شیخ کی صاحبزادیوں کے مشورے سے، حضرت شیخ کے ایک بڑے علمی معاون، دائمی رفیق اور ترجمہ وفوائد [نیز اس مقدمہ کی تالیف سے] سب سے زیادہ واقف تھے، ہمیشہ اس خدمت سے وابستہ رہنے والے، اس کام میں شیخ الہند کے دست راست اور معاون، مولانا عزیر گل صاحب کی نگرانی میں، چھپنے کے لئے چلا گیا تھا، ابھی اس کی طباعت پوری نہیں ہوئی تھی، کہ شیخ الہند وفات پا گئے، لیکن اشاعت کا عمل جاری رہا، شیخ کی وفات کے فوراً بعد، یہ مقدمہ چھپ کر پریس سے آ گیا تھا۔ اس طباعت کے آخر میں صراحت ہے کہ:

> ''الحمد للہ کہ رسالہ ہذا تمام ہوا، لیکن افسوس ہے کہ ہم نے حضرت کی حیات میں، اس کو طبع کرنا شروع کیا تھا، مگر پورا نہ ہوسکا اور ۱۸/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو آپ، اس عالم کو خیر باد کہہ کر، رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
>
> محمد عماد الدین انصاری، ناظم مطبع قاسمی دیوبند، ضلع سہارنپور''

اس اطلاع کے بعد، اس اشاعت کے سرورق (Tital) کے تمام مندرجات پر بھی ایک نظر ڈال لینا بہتر ہوگا۔ ملاحظہ ہو:

زبدۃ الکاملین، قدوۃ العارفین، خاتم المفسرین، فخر المحدثین، شیخ المشائخ والمسلمین، حضرت الامام

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی تصنیف لطیف

مقدمہ

ترجمہ قرآن شریف

جس کو حضرت شیخ الہند مرحوم نے بزمانۂ اسیری مالٹا تکمیل کو پہنچایا، اس سے پہلے کہ ترجمۂ قرآن مجید طبع کیا جائے، اُس کا مقدمہ علیحدہ طبع کر کے، شائع کرنا مناسب

خیال کیا گیا، جس سے شائقین کلام ربانی کو، اس ترجمہ کی پوری پوری حالت اور واقعی
اہمیت کا، بخوبی انداز ہو جائے گا۔
بسر پرستی حضرت مولانا **مولوی محمد مبین** صاحب، خطیب دیوبند و مولانا **مولوی عزیر گل** صاحب
اسیر مالٹہ وخادمان خصوصی، حضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہ
بندہ **محمد مہدی** عثمانی منتظم خلافت عثمانی دارالاشاعت والتجارت
دیوبند ضلع سہارنپور، یوپی۔ انڈیا نے
صرف ٹائٹل مطبع ہاشمی میرٹھ میں مولوی محمد سعید سے چھپوا کر شائع کیا۔

مقدمہ کی اس طباعت کے سرورق پر، جو عبارت درج ہے، یہاں اس کا پڑھ لینا بھی ضروری ہے۔
لکھا ہے:

''مقدمۂ ترجمہ قرآن مجید، جس کو حضرت شیخ الہند مرحوم نے بزمانۂ اسیری مالٹہ، تکمیل کو پہنچایا، اس سے پہلے کہ ترجمہ قرآن مجید طبع کیا جائے، اس کا مقدمہ علیحدہ طبع کر کے شائع کرنا، مناسب خیال کیا گیا۔''

یہ مقدمہ، حضرت شیخ الہند کی صاحبزادیوں کی ایما پر، مولانا عزیر گل اور مولانا مبین صاحب دیوبندی کی سرپرستی میں دیوبند سے چھپا تھا، اور اس کے حقوق اشاعت، شیخ الہند کی صاحبزادیوں کے لئے محفوظ تھے۔ لکھا ہے کہ:

''اس ترجمہ قرآن کے جملہ منافع وحقوق، صاحبزادیوں اور محترم برادرزادگان اور برادران شیخ الہند کے لئے محفوظ ہیں۔ بلا اجازت ان کی کوئی صاحب قصد طبع نہ فرمائیں''۔

ان اقتباسات سے کئی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔

الف: پہلی بات تو یہی ہے کہ اس کی طباعت کا، حضرت کی صاحبزادیوں نے اہتمام کیا تھا، مولانا مبین صاحب کے علاوہ، مولانا عزیر گل صاحب بھی، اس کے نگراں و سرپرست تھے، اور یہ بات حیات شیخ الہند، ترجمۂ قرآن مجید شیخ الہند اور تحریک شیخ الہند سے دلچسپی رکھنے والے، اچھی طرح جانتے ہیں، کہ مولانا

عزیر گل، شیخ الہند کی حیات وخدمات، اسارت مالٹا، نیز ترجمۂ قرآن مجید کے افادات اور مقدمۂ ترجمۂ قرآن مجید کی، تالیف وتحریر میں، شیخ الہند کے دائمی معاون اور رفیق تھے، ترجمہ قرآن شریف کے مراحل ہوں، یا افادات اور مقدمہ کی تالیف کی بات، ہر ایک میں مولانا عزیر گل، پوری طرح شریک وکارفرما رہتے تھے۔

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

ممکن نہیں کہ اس تحریر وتالیف کا کوئی مرحلہ اور عمل، مولانا گل کی غیر موجودگی میں طے پایا ہو اور مولانا اس سے بے خبر رہے ہوں۔ مولانا گل کا اس مقدمہ کی طباعت کے لئے اہتمام بتا رہا ہے کہ یہی مقدمہ، جس کو شیخ الہند کی دختران محترم نے چھپوایا تھا اور جس کے مولانا گل صاحب نگراں نیز منصرم طباعت بنائے گئے تھے، شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن مجید کا اصل مقدمہ تھا۔ یہی مقدمہ شیخ الہند نے اپنے ترجمہ میں شامل کرنے کے لئے، مالٹا کی جیل میں تحریر فرمایا تھا، اسی لئے یہ مقدمہ شیخ الہند کی حیات میں چھپنے کے لئے، چلا گیا تھا۔

مگر شیخ الہند کی وفات کے بعد، جب اس مقدمہ کی پہلی طباعت پر، پانچ سال گزر گئے تھے، مدینہ پریس بجنور سے شیخ الہند کا ترجمۂ قرآن مجید چھپ کر آیا، تو اس کے ساتھ یہ مقدمہ ترجمہ قرآن مجید، شامل نہیں تھا، ترجمۂ قرآن مجید کی پہلی طباعت کے بعد بھی، مقدمۂ ترجمہ قرآن مجید کا یہ متن، جو دیوبند سے شائع ہو چکا تھا، ترجمۂ قرآن مجید شیخ الہند کی کسی اشاعت میں شامل نہیں کیا گیا۔ ترجمۂ شیخ الہند کے ساتھ ایک مقدمہ اور چھپا تھا، جس پر اگرچہ یہ صراحت نہیں کہ یہ تالیف ومقدمہ، حضرت شیخ الہند کے قلم سے ہے، مگر اس کو ترجمۂ شیخ الہند کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہی سمجھا اور خیال کیا جاتا ہے، کہ ترجمۂ قرآن مجید شیخ الہند کے ساتھ شامل، مقدمہ بھی، حضرت شیخ الہند کے مبارک قلم اور بصیرت قرآنی کی یادگار ہے۔ حالانکہ اگر دونوں مقدموں کو سامنے رکھ کر مطالعہ کیا جائے، تو صاف معلوم ہو جاتا ہے، کہ دونوں میں واضح اور بڑا فرق ہے، بیسیوں جگہوں پر، دونوں کی عبارتیں مختلف ہیں، کوئی عبارت فقرہ یا پیراگراف پہلی طباعت میں موجود نہیں، کوئی دوسری سے غائب ہے، کئی موقعوں پر پوری بحث خاصی مختلف ہوگئی ہے۔ ترتیب مباحث والفاظ کا، عمومی اختلاف، تو جگہ جگہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ سوال بالکل فطری اور

طبع ہے، کہ ترجمہ شیخ الہند کے ساتھ، چھپنے والے مقدمہ کی، حقیقت ونوعیت کیا ہے، اس سلسلہ میں کئی سوالات ہیں، جو جواب اور توجہ چاہتے ہیں:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ جب اس ترجمہ کا وہ مقدمہ، جو نہایت معتبر تھا اور شیخ الہند کے حیات میں، طباعت کے لئے چلا گیا تھا، اس کو ترجمۂ قرآن مجید کے ساتھ، کیوں شائع نہیں کیا گیا؟ حالانکہ یہ مقدمہ، ترجمۂ قرآن مجید کی اشاعت (۱۳۳۹ھ) سے چھ سال پہلے شائع ہو چکا تھا، شیخ الہند سے وابستگی رکھنے والے اصحاب علم وذوق، اس سے پوری طرح واقف ہوں گے اور بہت سے، اس سے استفادہ بھی کر چکے ہوں گے، جس میں ترجمۂ قرآن مجید کے ناشر اور مدینہ پریس بجنور کے مالک، مولوی مجید حسن صاحب بھی یقیناً شامل ہوں گے، پھر کیا وجہ ہوئی کہ انہوں نے، شیخ الہند کا اصل مقدمہ، اپنے سامنے موجود ہوتے ہوئے، اس کو ترجمۂ قرآن مجید کے ساتھ، شائع نہیں کیا۔

(۲) شیخ الہند کا مقدمہ ترجمۂ قرآن مجید، جو شائع شدہ اور معتمد تھا، کسی وجہ سے اگر اس کو ترجمۂ قرآن مجید کے ساتھ، شائع نہیں کیا جا رہا تھا، تو کیا ضرورت تھی کہ حضرت شیخ الہند کے نام سے، ایک نیا مقدمہ، ترجمہ کے آغاز پر شامل کیا جاتا؟

(۳) وہ کون عالم تھے، جنہوں نے ترجمہ شیخ الہند کا یہ نیا متن مرتب کیا، اور اس میں وہ چیزیں شامل کیں، جو شیخ الہند کی تحریر میں، موجود نہیں تھیں اور ایسی متعدد عبارتیں نکال دیں، حذف کر دیں، یا ان کو دوبارہ اپنی ترتیب کے مطابق لکھا، جو شیخ الہند کے مقدمہ میں، موجود اور شائع شدہ تھیں۔

(۴) اگر حضرت شیخ الہند کے، اصل مقدمہ قرآن مجید کو، ترجمہ قرآن مجید شیخ الہند کے ساتھ شامل نہیں کرنا تھا، تو اس میں کسی اور مقدمہ کی غالباً ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر کسی وجہ سے، اس طرح کے کسی مقدمہ کی شمولیت واشاعت ضروری سمجھی گئی، تو شیخ الہند کے مقدمہ کو کانٹ چھانٹ کر، ترمیم واضافہ کر کے شائع کرنا بے محل

تھا۔ نیا مقدمہ شامل کر کے، اس مقدمہ کے مرتب کے نام کی صراحت ضروری تھی، بہتر ہوتا کہ اس مقدمہ کا، شیخ الہند کے حوالہ سے تعارف نہ ہوتا اور اس کی شیخ الہند سے نسبت نہ ہونے کی، ضاحت کر دی جاتی۔

(۵) ترجمہ شیخ الہند کے ساتھ شائع مقدمہ پر، اگر چہ شیخ الہند کا نام درج نہیں، لیکن اس کو ترجمہ کے آغاز پر، جس طرح شامل کیا گیا ہے، اس سے یہ خیال عین متوقع ہے، کہ یہ مقدمہ بھی شیخ الہند کا ہے۔

(۶) مقدمہ کی دونوں اشاعتوں کے حوالہ سے، ایک ایک سوال یا الجھن اور بھی سامنے آتی ہے، کہ جب ترجمۂ شیخ الہند، پہلی مرتبہ (۱۳۴۴ھ میں) چھپ کر آیا، جس میں یہ نیا مقدمہ شامل تھا، اس وقت شیخ الہند کے اکثر شاگرد حیات تھے، ان کے علاوہ، اور بھی ایسے سینکڑوں اشخاص ہوں گے، جنہوں نے شیخ الہند کے مقدمہ کی پہلی طباعت پڑھی، دیکھی ہوگی، ان صاحبان کی، دونوں اشاعتوں کے اختلافات وترمیمات پر، کیوں نظر نہیں گئی، اس پر کوئی ردِّ عمل، تبصرہ وتنقید اور وضاحت کیوں سامنے نہیں آئی، کہ اس مقدمہ کا، شیخ الہند سے انتساب درست نہیں، اس میں فلاں فلاں مقامات پر، ترمیمات اور کثیر حذف واضافہ ہوا ہے؟

(۷) یہاں یہ خیال قابل قبول نہیں ہوسکتا، کہ یہ ترمیمات یا اضافے، خود حضرت شیخ الہند نے کئے ہوں گے، یا شیخ الہند کی اجازت یا مشورہ سے، شیخ کے کسی شاگرد و نیاز مند نے، اس پر مکمل نظر ثانی کی ہوگی، اگر ایسا ہوتا تو شیخ الہند کی صاحبزادیاں، اسی نسخہ کو چھاپتیں اور مولانا عزیز گل بھی اسی متن اور نسخہ پر توجہ فرماتے، جو شیخ الہند کا آخری ترمیم تصحیح کیا ہوا نسخہ تھا۔ اس صورت میں مقدمہ شیخ الہند کی پہلی طباعت میں، یہ وضاحت، یا اس کا اشارہ ہونا چاہئے تھا، کہ اس کا ترمیم وتصحیح سے مزین ایک نسخہ، یا ایک متن اور بھی ہے، جس کی بعد میں اشاعت متوقع ہے، لیکن ایسی کوئی عبارت یا وضاحت مقدمہ کی پہلی طباعت میں موجود نہیں، جس سے یہ بات بالکل صاف اور طے ہو جاتی ہے کہ

ترجمۂ شیخ الہند کا اصل مقدمہ، وہی تھا جو شیخ الہند کے گھر سے، شیخ کی حیات میں چھپنے کے لئے چلا گیا تھا۔ اس لئے یہ سوال جوں کا توں باقی ہے، کہ شیخ الہند کے ترجمہ کے ساتھ، جو مقدمہ عموماً چھپتا ہے، وہ کس کا اثر یا تالیف ہے؟

(۸) شیخ الہند کے شاگردوں کو، حق وصداقت کے اظہار کا جس قدر احساس ومزاج تھا اور شیخ الہند سے ان سب کو جو دلی انسیت وارادت تھی، اس میں یہ بھی متوقع نہیں کہ شیخ الہند کے کسی شاگرد نے، شیخ کے مؤلفہ مقدمہ یا اہم تالیف میں، شیخ کی اجازت واطلاع کے بغیر ترمیم وتنسیخ کی ہو، یا اس میں کثیر حذف واضافات کر دیئے ہوں اور اس نئی تالیف کو شیخ الہند کے نام سے شائع کرنے پر تیار ہو گئے ہوں، یا مدینہ پریس والوں کو، اس کے چھاپنے کی اجازت دیدی ہو؟

(۹) غور کیجئے تو خیال ہوتا ہے کہ مقدمہ شیخ الہند کی ترمیم وتنسیخ اور ترتیب نو کا کام غالباً مدینہ پریس بجنور کے مالک، مولوی مجید حسن صاحب نے، مدینہ پریس کے کسی ذی علم ملازم سے کرایا ہے، اور اس کو ترجمۂ شیخ الہند کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

اس ترمیم واصلاح کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے، کہ شیخ الہند کا مقدمہ کئی سال پہلے شائع ہو کر عام ہو چکا تھا اور اس ترجمہ کی پہلی طباعت کے وقت، مقدمۂ قرآن کی پہلی طباعت کے نسخے عام اور اکثر قارئین کے سامنے ہوں گے اور پہلی طباعت میں صاف اعلان ہے، کہ اس مقدمہ کی طباعت کے تمام حقوق، شیخ الہند کی صاحبزادیوں کے نام محفوظ ہیں۔ چونکہ مقدمہ کی پہلی طباعت کا قصہ تازہ تھا، اور صاحبزادیوں کے نام اس کے حقوق محفوظ ہونے کی وجہ سے، کوئی بھی شخص یا ادارہ، اس مقدمہ کو دوبارہ شائع نہیں کر سکتا تھا، مولوی مجید حسن صاحب بھی، اصل نسخہ کی طباعت کا ارادہ نہیں کر سکتے تھے، لیکن ترجمہ شیخ الہند کے ساتھ، اس مقدمہ کی طباعت کی بات ہی ہوئی، اور مقدمہ کے اس طباعت کے ساتھ شائع کرنے سے ترجمہ کی افادیت ومعنویت میں اضافہ ہونا بالکل واضح تھا، اس لئے مولوی مجید حسن صاحب نے جو قانونی پابندی کی جہ سے مطبوعہ مقدمہ کو، جوں کا توں ترجمۂ شیخ الہند کے ساتھ شامل وشائع نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے چاہا کہ مقدمہ چھپے مگر وہ قانون اور حق طباعت کی گرفت میں آنے

سے محفوظ رہیں، شاید اسی وجہ سے شائع مقدمہ کو کثیر ترمیمات اور حذف واضافہ کے بعد، اس طرح مرتب کرالیا کہ، اس کو مقدمہ شیخ الہند بھی کہا جا سکے اور اس کی مقدمہ کی، پہلی طباعت سے یکسانیت اور کامل ہم آہنگی بھی نہ ہو کہ مدینہ پریس سے، اس کی طباعت پر، قانونی گرفت سے آزاد رہے۔اس لئے ترجمہ شیخ الہند کی پہلی اور بعد کی تمام طباعتوں کے ساتھ، مقدمہ شیخ الہند کا ایک نیا ترمیم شدہ متن، شائع کردیا گیا۔

اگر مقدمہ کی دونوں اشاعتوں کے ان پہلوؤں پر غور کیا جائے، ان کو سامنے رکھا جائے، تو اس میں شک نہیں رہتا، اصل مقدمہ وہی ہے، جو شیخ الہند کی حیات میں، اشاعت کے لئے پریس چلا گیا تھا، وہی شیخ الہند کی یادگار ہے، ترجمۂ شیخ الہند کے ساتھ، مدینہ پریس سے شائع مقدمہ کو، شیخ الہند سے وابستہ کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا، مگر افسوس ہے کہ اصل مقدمہ، پہلی طباعت کے بعد سے آج تک، دوبارہ کبھی نہیں چھپا، مجھے اس کی کسی اور اشاعت کا سراغ نہیں ملا، شیخ الہند پر لکھی گئی کتابوں، مضامین نیز ترجمۂ شیخ الہند کے متعلق مباحث میں بھی، مقدمہ کی اس پرانی طباعت کا، ضمناً بھی تذکرہ نہیں آیا۔اس مقدمہ کو ایک بڑی دینی علمی یادگار کے طور پر شائع کیا جارہا ہے۔

اصل مقدمہ چند متعلقات کے ساتھ، عن قریب طباعت کے لئے جارہا ہے، اس لئے اس کا عکس شائع نہیں کیا جارہا لیکن پہلی طباعت اور موجودہ معروف طباعت کے اختلاف کا ایک مفصل جائزہ یا گوشوارہ آئندہ صفحات میں دیا جارہا ہے، جس سے شیخ الہند کے اصل مقدمہ اور بعد میں ترجمہ شیخ الہند کے ساتھ شائع مقدمہ کے اختلافات کا مطالعہ اور ان کا علمی فنی تجزیہ آسان ہوگا۔اصل مقدمہ معروف ومشہور مقدمہ اور ترجمہ شیخ الہند کی سب سے پہلی طباعت ۱۹۴۴ء چند اور مندرجات ومشتملات پر مرتب راقم سطور کی تالیف اسی اشاعت کے ساتھ چھپ رہی ہے، جو تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے، مزید معلومات ومباحث کے لئے اس کو ملاحظہ فرمائیں۔

مقدمہ ترجمہ قرآن مجید شیخ الہند

سب سے پہلی اور معروف طباعت میں اختلاف الفاظ ومباحث

﴿ طبع اول کے مندرجات ﴾	﴿ معروف طباعتوں کے الفاظ وکلمات ﴾
ص:۲ خدا "مدح" آفرین مصطفیٰ بس	ص:۵ خدا مدح [کذام ذح] آفرین مصطفیٰ بس
// خاطی وجانی	// آثم وعاجز
// سبحانہ	// تعالیٰ
// احباب ومخلصین	// احباب اور مکرمین
// فرمایا اگر	// درخواست کی کہ
// ومطلب	// مطلب
// مناسب اور کار آمد اہل زمانہ ہو جاوے	// مناسب حال اہل زمانہ کیا جاوے
// تو نہایت مفید ہے	// جس سے دیکھنے والوں کو فائدہ پہنچے
// اور اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس کے دیکھنے سے ناظرین کو بسہولت نفع پہنچ سکے۔	// یہ عبارت نہیں ہے۔
// اور وہ خلل اور لفظی	// اور وہ نقصان اور خلل اور لفظی
ص:۳ جو آزادی پسند	// جو بعض آزادی پسند
// ان سے جو کوئی بچنا چاہے تو آسانی سے بچ سکے۔	// ان سے بچاؤ کی صورت نکل آوے
// اس عاجز نے اپنی بے بضاعتی کے علاوہ عرض کیا	// اس عاجز نے اس درخواست کے جواب میں اپنی بے بضاعتی کے علاوہ یہ عرض کیا

ص:۳ اردو کے تراجم موجود ہیں۔

〃 ثانیاً علماء متدینین کے زمانۂ حال میں

〃 متعدد تراجم یکے بعد دیگرے

〃 جو اہل اسلام کو نفع پہنچانے او رمذکورہ بالا خرابیوں سے بچانے کے لئے بحمداللہ کافی سے بھی زائد ہیں۔

〃 منجملہ ان کے دوترجموں کواحقر نے بھی تفصیلی نظر سے دیکھا ہے، اول مولوی عاشق الٰہی صاحب ساکن میرٹھ کا۔ دوسرا مولانا اشرف علی صاحب کا جو عمدہ اور نافع ہونے کے علاوہ سلف صالحین کے مسلک کے موافق اور مذکورہ بالا خرابیوں سے پاک ہیں

〃 پھراب کسی جدید ترجمہ کی کیا حاجت ہے۔

〃 مگر مخلصین نے اس پر بس نہ کی تو مجبور ہوکر یہ عرض کیا کہ واقعی اس وقت تک کوئی امر

〃 ایسا خیال میں نہیں آتا کہ جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی ہمت اور جرأت کروں مگر آپ کے اصرار کی وجہ سے اب احقر تراجم معتبرہ قدیمہ وجدیدہ کوغور سے دیکھتا ہے۔

ص:۵ اردو کے متعدد تراجم موجود ہیں۔

〃 اس کے علاوہ علماء متدیّنین زمانۂ حال کے

〃 متعدد تراجم یکے بعد دیگرے بحمداللہ

〃 جولوگوں کو مذکورہ بالا خرابیوں سے بچانے کے لئے کافی ووافی وشافی ہیں۔

〃 چنانچہ بندہ کے احباب میں بھی اول مولوی عاشق الٰہی صاحب سلمہ ساکن میرٹھ نے ترجمہ کیا اس کے بعد مولانا اشرف علی صاحب سلمہ اللہ نے ترجمہ کیا، احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا ہے، جو ان خرابیوں سے پاک صاف ہیں اور عمدہ ترجمے ہیں۔

〃 پھراب کسی جدید اردو ترجمہ کی کیا حاجت ہے۔

〃 بجز اس کے کہ اسماء مترجمین میں ایک نام اور زیادہ ہوجاوے اور کوئی نفع

〃 نہیں معلوم ہوتا مگر مکرمین احباب نے اس پر بھی بس نہ کی اور اسی اصرار پر قائم رہے تو مجبور ہوکر مجھ کو یہ عرض کرنا پڑا کہ اس وقت تک میرے خیال میں کوئی ایسا نفع نہیں آیا کہ جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی جرأت اور ہمت کروں، اب آپ کے اصرار پر احقر تراجم

ص:۱۳ اگر کوئی منفعت اور ضرورت سمجھ میں آ گئی تو اس کے موافق انشاءاللہ آپ صاحبوں کے فرمانے کی تعمیل میں سعی کروں گا ورنہ معذور ہوں۔

ص:۳-۴ اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ اسرارہم کے تراجم کے مطالعہ سے یہ تو خوب دلنشیں ہوگیا کہ یہ اکابر مرحومین ہماری ضرورت کو احساس فرما کر اگر اس کا انتظام نہ فرما جاتے تو[ص:۳] آج اس سہولت اور کثرت سے ہم کو تراجم کلام الٰہی اچھے سے اچھے اپنی زبان اور اپنے ملک میں نظر نہ آتے اور عجب نہ تھا کہ جیسے خود ہندوستان وسیع ملک میں بہت سی زبانیں اور بہت سے اطراف اور نیز دیگر ممالک میں مسلمانوں کی بڑی بڑی قومیں اور مشہور اور ذوالاقتدار جماعتیں اس عزت اور نعمت سے خالی یا بمنزلہ خالی نظر آتی ہیں، ہم بھی آج اسی نکبت اور نحوست میں مبتلا ہوتے۔ فجزاهم الله عنا احسن الجزاء وافضل الجزاء.

قدیمہ اور جدیدہ کو بنام خدا غور سے دیکھتا ہے۔

// اس کے بعد اگر کوئی نفع سمجھ میں آیا تو اس کے موافق آپ صاحبوں کے فرمانے کی تعمیل کا ارادہ کروں گا، ورنہ معذور ہوں۔

// اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے تراجم کو جو غور سے دیکھا تو یہ امر تو بے تأمل معلوم ہوگیا کہ اگر یہ مقدسین اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمت کو انجام نہ دے جاتے تو اس شدت ضرورت کے وقت میں ترجمہ کرنا بہت دشوار ہوتا، علماء کو صحیح اور معتبر ترجمہ کرنے کے لئے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑتا اور بہت ہی فکر کرنا ہوتا اور ان دقتوں کے بعد بھی شاید ایسا ترجمہ نہ کر سکتے جیسا اب کر سکتے ہیں، پھر بھی کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہوتا تو ہوتا کہ کمال علم وتدین کے ساتھ اس مشقت کو گوارا کر کے اس خدمت کو کماینبغی انجام دینے کے لئے موفق ہوتا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھئے کہ اس بے نظیر علمی وعملی کمالات پر جو انہوں نے اپنے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے انعامات متعدد رسالوں میں بیان فرمائے ہیں ان انعامات عظیمہ میں یہ ترجمہ مسمیٰ به

فتح الرحمن بھی داخل ہے، اور عاجز نے اپنے بعض مرحوم بزرگواروں سے سنا ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ جب موضح قرآن لکھ چکے تو فارسی کا ایک شعر تھوڑا سا تصرف کر کے اس طرح پڑھتے تھے۔ شعر...

روز قیامت ہر کسے با خویش دارد نامۂ
من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآن در بغل

اس سے ان حضرات مرحومین کا کمال علم وتدین تو معلوم ہوتا ہی ہے اسی کے ساتھ قرآن شریف کے صحیح تراجم کی عظمت اور ضرورت بھی ظاہر ہوتی ہے، بالجملہ اگر اکابر مرحومین ہماری ضرورت اور منفعت کو احساس فرما کر پہلے ہی سے اس کا انتظام نہ کر جاتے تو آج اس کثرت اور سہولت کے ساتھ ہم کو تراجم کلام الٰہی اچھے سے اچھے ہرگز میسر نہ ہوتے، اور کچھ عجب نہ تھا کہ جیسے خود ہندوستان میں بہت سی زبانیں اور دیگر ممالک میں مسلمانوں کی بڑی بڑی قومیں اس نعمت اور عزت سے خالی یا مثل خالی کے ہیں، ہم بھی اسی نکبت میں مبتلا ہوتے۔ فجزاهم الله عنا وعن جميع المسلمين احسن الجزاء وافضل الجزاء والحمدلله.

ص:۴ جو محسن کش ان تراجم کی قدر نہ کریں اوران میں نقطہ چینی کو اپنے لئے موجب فخر وسرخروئی خیال کریں وہ بے شک ارشاد من لم یشکر الناس لم یشکر الله کے مصداق اور پیشین گوئی لعن آخر هذه الامة أولها او کماقال کے مصدّ ق ہیں۔

واذا أتتك مذمتی من ناقص
فهی الشهادة لی بأنی کامل

〃 یہ عبارت نہیں ہے۔

ص:۴ اسی کے ساتھ یہ امر بھی اچھی طرح سمجھ میں آ گیا کہ جو لوگ زبان عربی سے ناواقف ہیں ان کے لئے اگرچہ ترجمہ تحت لفظی میں بعض مخصوص فائدے ہیں جو بامحاورہ ترجمہ میں نہیں،مگر ترجمہ سے جو بڑی غرض یہ ہے کہ عام اہل اسلام ہند کو قرآن شریف کا سمجھنا سہل ہوجاوے یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہوسکتی ہے تحت لفظی سے ممکن نہیں۔

〃 اسی کے ساتھ یہ بات بھی دل نشیں ہوگئی کہ ہر چند ترجمہ تحت لفظی میں بعض خاص فائدے ہیں مگر ترجمہ سے جو اصلی فائدہ اور بڑی غرض یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو قرآن شریف کا سمجھنا آسان ہوجاوے یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہوسکتی ہے، تحت لفظی ترجمہ سے کسی طرح ممکن نہیں۔

ص:۴-۵ چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ جو کہ بامحاورہ اردو ترجمہ کے بانی اور امام ہیں انہوں نے ترجمہ تحت لفظی کے چھوڑنے اور بامحاورہ ترجمہ کو اختیار کرنے کی یہی وجہ بیان فرمائی ہے اور یہی وجہ ہے جو ان کے بعد

〃 چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ جو بامحاورہ ترجمہ کے بانی اورامام ہیں، انہوں نے بامحاورہ ترجمہ کو اختیار فرمانے کی یہی وجہ بیان کی ہے، اور یہی وجہ ہے جو اسلاف ممدوحین کے بعد اس زمانہ میں جس نے اس میدان

جس نے اس میدان میں[ص:۴] قدم رکھا اس نے جناب ممدوح کا اتباع کیا۔

ص:۵　اسی ذیل میں حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ بامحاورہ میں جو اہل زمان حال کو دو شکایتیں ہیں، ان کا حال بھی معلوم ہوگیا کہ وہ شکایتیں بے اصل تو نہیں ہاں زمانہ کی سہولت پسندی اگر خوردبیں کا کام دے رہی ہو تو اس کے انکار کی بھی حاجت نہیں۔

میں قدم رکھا اس نے جناب شاہ صاحب ممدوح کا اتباع کیا۔

ص:۵　اور یہ امر بھی خوب معلوم ہوگیا کہ جیسے حضرت شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ کا یہ کمال ہے کہ تحت لفظی ترجمہ کا التزام کرکے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا، ایسے ہی حضرت مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کمال ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہوکر پھر نظم وترتیب کلمات قرآنی اور معانی لغویہ کو اس حد تک نباہا ہے کہ زیادہ کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ہم جیسوں کا ہرگز کام نہیں، اگر ہم ان کے کلام کی خوبیوں کو اور ان اغراض اور اشارات کو جو ان کے سیدھے سیدھے مختصر الفاظ میں ہیں سمجھ جاویں تو ہم جیسوں کے فخر کے لئے یہ امر بھی کافی ہے، اس کے بعد اب ہم کو ضرور ہوا کہ خاص طور پر حضرت شاہ مولانا عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ بامحاورہ مسمّی بہ موضح قرآن کو دیکھ کر اول یہ سمجھیں کہ جناب شاہ صاحب ممدوح کا ترجمہ جس کا اپنی نوعیت میں اول وافضل ہونا جملہ اہل علم وفہم اور ارباب انصاف ودیانت کو مسلم ہے اس میں ایسے

ص:۵ الحاصل اس میں شبہ نہیں کہ کہیں کہیں کوئی کلمہ ایسا پایا جاتا ہے کہ زمانہ حال میں قریب بمتروک یا متروک شمار ہوتا ہے اور چونکہ حضرت ممدوح نے شرائط ترجمہ کی رعایت پوری فرمائی ہے اور کلمات قرآنی کی لفظاً اور معنیً متابعت اور مطابقت کا برابر لحاظ رکھا ہے تو اس لئے بعض مقامات میں بوجہ اختصار عبارت مطلب میں بھی ضرور کسی قدر دقت پیش آتی ہے بس یہ دو باتیں ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ موصوف کی عام نفع رسانی میں کوتاہی اور تنگی محسوس ہو رہی ہے، مگر اسی کے ساتھ جب ہم نے تراجم جدیدہ معتبرہ پر نظر ڈالی تو اہل زمانہ کی دونوں مذکورہ بالا

امور کیا ہیں جن کی وجہ سے ہم کو دوسرے کسی ترجمہ کی ضرورت ہو پھر یہ دیکھیں کہ جو تراجم جدیدہ اس زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں ان سے ہماری وہ ضرورت پوری ہوگئی یا اب تک کچھ باقی ہے کہ جس کے پورا کرنے کے لئے اور ترجمہ کی ابھی تک [ص:۵] حاجت چلی جاتی ہے۔ امر اول کی بابت جہاں تک ہم نے ملاحظہ کیا اور دیگر حضرات نے بھی اس کی تصدیق فرمائی۔

ص:۶ کل دو باتیں ایسی پائیں جس کی وجہ سے عام طور پر لوگ ترجمہ موصوف سے نفع اٹھانے میں قاصر ہیں اول بعض کلمات اور محاورات کا اس زمانہ میں متروک یا قریب بمتروک ہو جانا۔ دوسرے چونکہ حضرت شاہ صاحب مرحوم کلمات قرآنی کی موافقت اور مطابقت کا خیال زیادہ فرماتے ہیں اور شرائط ترجمہ کی پابندی بہت کرتے ہیں، اس لئے بعض مواقع میں بوجہ اختصار عبارت آج کل کی سہولت پسند طبائع کو مطلب سمجھنے میں بہت دقت معلوم ہوتی ہے، باقی رہا امر ثانی تو یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں اردو بامحاورہ طرز پر بکثرت

شکایت کی پوری مکافات ان تراجم میں نظر آئی۔ منجملہ تراجم جدیدہ معتبرہ کے دو ترجمے جن کو احقر نے تفصیل سے دیکھا ہے ان کی تصریح پہلے عرض کر چکا ہوں نہ ان میں کلمات متروکۃ الاستعمال ہیں نہ عبارت میں وہ تنگی۔

ص:۵-۶ الغرض جو خلل بوجہ تغیر زمان وتبدل لسان پیدا ہو گیا تھا اس کا دفعیہ بخوبی [ص:۵] ہو گیا اور اسی کے ساتھ جو مفاسد واغلاط کہ بعض غیر مقید اور قلیل الاستعداد صاحبوں کے تراجم سے ظاہر ہوئے تھے ان کا بھی کفارہ ہو گیا۔ **فالحمدلله و جزاهم الله** نظیریں وجوہ ظاہر ہے کہ اب ہم کو ترجمہ جدید کی ہرگز حاجت نہیں کیونکہ مقصود اصلی ترجمہ سے صرف یہ ہے کہ کلام الٰہی کا صحیح مطلب سلف صالحین کے مسلک کے موافق اہل اسلام ہند عامۃً بسہولت سمجھ سکیں

تراجم یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں، سو ان میں بالیقین بعض ایسے تراجم بھی ہیں جو علمائے معتبر اہل علم و دیانت کی لوجہ اللہ سعی کا نتیجہ ہے اور بعض بعض کو ہم نے بھی تفصیلی نظر سے دیکھا ہے، ہمارے نزدیک وہ تراجم بیشک ہماری اس حاجت کے پورا کرنے کے لئے کافی ہیں جو اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے بے نظیر ترجمہ میں اہل زمانہ کو پیش آ رہی تھی، **جزاهم الله سبحانه عنا وعن جميع مسلمي الهند خيراً.**

// اور ان اغلاط ومفاسد سے بچانے کے لئے بھی مفید ہیں جو بعض آزاد خیال صاحبوں کے تراجم میں موجود ہیں، اس لئے امر ثانی کی بابت اس عاجز کی یہ رائے ہے کہ وہ نزاکت ولطافت اور وہ ہر امر کی رعایت جو حضرت شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کے امتیازات اور خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں ان کا تو ذکر نہیں باقی وہ امر جو ترجمہ سے مقصود اصلی اور غرض ضروری ہے یعنی کلام الٰہی جل جلالہ کا صحیح مطلب سلف صالحین کے ارشادات کے موافق سہولت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی

سوتراجم موجودہ معتبرہ اس ضرورت کے پورا کرنے کے واسطے کافی وافی ہیں۔

ص:۶ شکر کرتے ہیں۔

// ہمارے معتبرین ومتدیّنین علماء کی توجہ اور سعی سے تراجم صحیحہ مفیدہ قدیمہ وجدیدہ اتنے نظر آتے ہیں کہ ایسے تراجم اور اتنے تراجم ہم کو کسی عجمی زبان میں باوجود تفتیش سننے میں بھی نہیں آتے۔

// پھر ایسی حالت میں ہمارا ترجمہ جدیدہ انگلی کٹا کر بلکہ صرف لہو لگا کر شہیدوں میں ملنے سے زیادہ مفید اور باوقعت نہیں ہوسکتا اور جب ہم خیال کرتے ہیں کہ جدید ترجمہ کرنا گویا درپردہ اورزبان حال سے یہ دعوی کرنا ہے کہ تراجم موجودہ ناکافی ہیں یا کم سے کم ہمارے ترجمے میں کوئی خوبی ومنفعت ایسی ہے جو دیگر تراجم میں نہیں تو جدید ترجمہ کرنا فضول سے بڑھ کر ہمارے لئے ایک شرمناک امر ہے۔

سمجھ میں آ سکے، اس امر کے لئے تراجم جدیدہ جو اہل علم ودیانت کی توجہ سے شائع ہو چکے ہیں وہ بالکل کافی اور وافی ہیں ہم کو کسی جدید ترجمہ کی اس وقت حاجت نہیں رہی، **شکر اللّٰہ تعالی مساعیھم.**

ص:۶ شکرادا کرتے ہیں۔

// ہمارے معتبر علماء کی حسن سعی سے تراجم مفیدہ قدیمہ وجدیدہ اتنے شائع ہو چکے ہیں کہ ایسے اور اتنے تراجم ہم کو کسی عجمی زبان میں نظر نہیں آتے۔

// اب اس کے بعد یہ بات تو بحمد اللہ ہم کو خوب محقق اور منقح ہوگئی کہ تراجم موجودہ صحیحہ معتبرہ کے ہوتے ہمارا جدید ترجمہ کرنا لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا ہے، جس سے نہ مسلمانوں کو کوئی نفع معتبر پہنچ سکتا ہے نہ ہم کو بلکہ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا جدید ترجمہ کرنا گویا زبان حال سے یہ کہنا ہے کہ تراجم موجودہ میں کوئی خلل ہے جس کا تدارک کیا جاتا ہے یا ہمارے ترجمہ میں کوئی خوبی اور منفعت زائد ہے جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی حاجت ہوئی، تو ہم کو

ص:۶-۷ سواب بلا کم وکاست اس حالت کا مقتضی یہ ہے کہ ہم ترجمہ کے خیال اور فکر سے خالی الذہن اور فارغ البال ہوکر مطمئن ہوجاویں مگر تراجم قدیمہ وجدیدہ کی دیکھ بھال [ص:۷] اوران کے موازنہ اور پڑتال میں حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ کی بہت سی خوبیں اور لطافتیں اور نزاکتیں اور لفظی او رمعنوی ہرطرح کی رعایتیں اتنی محسوس ہوئیں کہ جنہوں نے ترجمہ مذکور کی وقعت کو بدرجہا اس سے زیادہ دلنشیں کردیا جو ہمیشہ سے تھی بلکہ اس کی وجہ سے اردو زبان کی فصاحت وبلاغت اور وسعت ولطافت اس درجہ ذہن میں آ گئی کہ اردو کی کسی نظم ونثر سے بھی نہ آئی تھی پھر جب خیال کیا کہ اس مفید بے نظیر ترجمہ سے بوجہ ہر دوامر مذکورہ بالا چونکہ عام طبائع میں بے رغبتی آ رہی ہے تو کچھ بعید نہیں کہ ترجمہ مذکورہ رفتہ رفتہ تقویم پارینہ ہوجاوے۔ تو نہایت افسوس اور اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر ایک سرسری عذر کی وجہ سے ایک ایسا ذخیرۂ جدید ترجمہ کرنا فضول سے بڑھ کر نہایت مذموم اور مکروہ تک نظر آتا ہے۔

خیر یہ بات تو خوب دلنشیں ہوگئی اور ظاہر ہے کہ اس کا مقتضی یہ تھا کہ ترجمہ کلام الٰہی کے متعلق اب ہم کچھ ارادہ نہ کرتے مگر اس چھان بین اور دیکھ بھال میں تقدیر الٰہی سے یہ بات دل میں جم گئی کہ حضرت شاہ صاحب کا افضل ومقبول ومفید ترجمہ رفتہ رفتہ تقویم پارینہ ہوجاوے یہ کس قدر نا قدر دانی اور بدقسمتی بلکہ کفران نعمت ہے اور وہ بھی سرسری عذر کی وجہ سے اور عذر بھی وہ جس میں ترجمہ کا کوئی قصور نہیں اگر قصور ہے تو لوگوں کی طلب کا قصور ہے، اگر دیکھنے والے غور سے دیکھیں اور جو غور کے بعد بھی سمجھ میں نہ آوے اس کو جاننے والوں سے دریافت کریں تو پھر سب کام سہل ہوجاوے ،چنانچہ حضرت ممدوح نے خود شروع میں لکھ دیا ہے کہ قرآن شریف کے معنی بغیر سند کے معتبر نہیں، اور بغیر استاد کے معلوم نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں عوام کو یہ دشواری تو سب ترجموں میں پیش آتی ہے حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ میں کچھ زیادہ سہی۔

صلاح وفلاح ہمارے ہاتھ سے نکل جاوے
کہ جس کی مکافات وتدارک ہماری طاقت
سے باہر ہے تو یہ امر ہمارے حق میں کس
قدر محرومی اور بدقسمتی کا باعث ہوگا اور عذر
بھی وہ جس میں ترجمہ کا کوئی قصور نہیں اگر
قصور ہے تو ہماری طلب کا قصور ہے اگر
ناظرین غور اور فکر میں بخل نہ کریں اور جہاں
دریافت کرنے کی حاجت ہو تو دریافت
کرنے سے نہ شرمائیں نہ گھبراویں تو
بسہولت منتفع ہوسکتے ہیں انہیں وجوہ سے
حضرت ممدوح نے شروع میں لکھ دیا ہے کہ
قرآن شریف کے معنی بغیر سند استاذ نہ معلوم
ہوتے ہیں نہ معتبر ہوسکتے ہیں علاوہ ازیں یہ
دشواری تو سبھی تراجم میں موجود ہے معلم سے
کونسا ترجمہ مستغنی کرسکتا ہے حضرت شاہ
صاحب کے ترجمہ میں کچھ زیادہ سہی۔

ص:۷-۸-۹ الحاصل اس خیال سے قلق ہوا تو اسی
قلق میں یہ بات ذہن میں آئی کہ
دو شکایتیں [ص:۷] جن کا یہ افسوسناک نتیجہ نظر
آتا ہے اگر ان کا تدارک اس طرح پر
ہوجاوے کہ الفاظ متروکہ اور غیر مشہورہ کی جگہ
الفاظ مستعملہ اور مشہورہ بدل دیے جاویں

اس لئے اس ننگ خلائق کو یہ خیال ہوا کہ
حضرت شاہ صاحب ممدوح کے مبارک مفید
ترجمہ میں لوگوں کو جو کل دو خلجان ہیں یعنی ایک
بعض الفاظ ومحاورات کا متروک ہوجانا۔
دوسرے بعض بعض مواقع میں ترجمہ کے
الفاظ کا مختصر ہونا جو اصل میں تو ترجمہ کی خوبی

اور ابہام کے موقعہ پر کوئی مختصر لفظ بڑھا کر یا الفاظ میں کوئی تصرف مناسب کر کر واضح کر دیا جاوے تو باذن اللہ اس صدقہ جاریہ کی بقا کی صورت نکل سکتی ہے اور ہم بھی محرومی کی مضرت اور ناشکری کی نحوست سے بچ سکتے ہیں۔ علماء کرام ہر زمانہ میں حسب حاجت اپنی ہمت اور توجہ سے "تراجم مستقلہ" اہل اسلام کی ہدایت اور نفع رسانی کے لئے مہیا فرماتے رہتے ہیں ہم اگر یہ نہ کر سکیں تو آؤ ایک افضل اور مقبول ومفید ترجمہ کی برائے نام خدمت کر کے ان حضرات سے کچھ مناسبت ومشابہت کی برکت وعزت ہی حاصل کر لیں، اور شاید اس حیلہ سے خدام کلام الٰہی کی فہرست کے کسی گوشہ پر جگہ مل جاوے بقول شخصے.....

بوسم من بے برگ ونوا برگ حنارا
تابوسہ بہ پیغام دہم آن کف پارا

// اس مضمون کو سوچ سمجھ کر جب اپنے مخلصین اور مکرمین کے روبرو پیش کیا تو ان حضرات نے بھی احقر کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا اور بالآخر یہی قرار پایا کہ بیشک مستقل ترجمہ سے زیادہ مفید اور

تھی مگر ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت اب یہاں تک نوبت آ گئی کہ جس سے ایسے مفید وقابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے سو اگر غور واحتیاط کے ساتھ ان الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ لے لئے جاویں اور اختصار واجمال کے موقعوں کو تدبر کے ساتھ کوئی لفظ مختصر زائد کر کے کچھ کھول دیا جاوے تو پھر انشاءاللہ حضرت شاہ صاحب کا یہ صدقہ فاضلہ بھی جاری رہ سکتا ہے اور مسلمانان ہند بھی اس کے فوائد مخصوصہ سے خالی نہ رہ جاویں گے۔

// اس مضمون کو سوچ سمجھ کر جو اپنے مکرمین مخلصین کی خدمت میں پیش کیا تو ان حضرات نے بھی اس عاجز کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا۔ اور یہی بات دلنشیں ہوگئی کہ مستقل ترجمہ سے یہ امر زیادہ مناسب

کارآمد یہی امر ہے کہ ترجمہ موصوفہ کی خدمت گذاری میں سعی کی جائے خدا کرے کہ یہ سعی ٹھکانے لگ جاوے اور ہر دو خلجان مذکورہ بالا سے ترجمہ موصوف صاف ہوکر اپنی فصاحت وسلاست سے دور نہ جا پڑے۔ **اللھم الھمنی رشدی واعذنی من شر نفسی.** [ص:۸] ان مراحل کے طے کرنے کے بعد یہ عاجز وضعیف ترجمہ موصوفہ کی خدمت گذاری کو اپنی سعادت سمجھ کر بنام خدا مستعد ہوگیا اور کام شروع کردیا گویا اپنی تہی دستی اور بے مائیگی کی وجہ سے ایک گراں بہا دوشالہ میں بوسیدہ کمبل سے رفو کرنے کا ارادہ کردیا خداوند ستارالعیوب کی پردہ پوشی سے اگر ہماری ناچیز کلمات مصری کے دہاگوں اور غلہ کے سنگریزوں اور تنکوں کی طرح کسی حساب میں آجاویں تو کون مانع ہے۔ **وھو الملك البر الرؤف الرحیم.**

شنیدم کہ در روز امید وبیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

وگرنہ ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا۔ جب ایک ثلث قرآن کے ترجمہ کی خدمت اور مفید ہے کہ موضح قرآن میں جو شکایت پیدا ہوگئی ہے اس کے رفع کرنے میں کوشش کی جاوے جب یہاں تلک نوبت پہنچ چکی تو یہ عاجز بنام خدا اس خدمت کے انجام دینے کے لئے تیار ہو بیٹھا گویا دوشالہ میں کمبل سے جگہ جگہ رفو کرنے کا ارادہ کردیا جب ایک ثلث قرآن کا ترجمہ کرچکا تو بوجہ بعض عوارض ایسا طول طویل حرج پیش آیا کہ ترجمہ کی تکمیل کی توقع بھی دشوار ہوگئی، مگر بتوفیق الٰہی عین ایام حرج میں اتنا اطمینان نصیب ہوگیا کہ ترجمہ موصوف باطمینان ۱۳۳۶ھ میں پورا کرلیا۔ ''إِنَّ رِبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَایَشَاءُ'' وَالْحَمْدُ للّٰه.

اور درستی سے فارغ ہوگئے تو ایسا طویل وبعید حرج پیش آیا کہ ترجمہ موصوفہ کی تکمیل کا خیال فراموش شدہ خواب سے زیادہ باوقعت نہ تھا مگر باذن اللہ وہی حرج قیاس اور توقع کے خلاف سرمایۂ اطمینان بن گیا اور ارشاد **وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُو شَيْئًا وَهُوَخَيْرٌ لَّكُمْ** [سورة التوبه الآية: ٢١٦] کی صداقت اور دعائے **رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ** [سورة يوسف الآية:٣٣] کی اجابت گویا آنکھوں سے دیکھ لی اور گو سامان ناکافی تھا مگر اس پر بھی خدمت مذکور عرصۂ قلیل میں ۱۳۳۶ھ کے اندر ایسے اطمینان سے پوری ہوگئی کہ جو اطمینان سامان کی حالت میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔

درخواب ندیدہ بود میلے
آسود گئے کہ درلحد دید

"**اِنَّ رَبِّی لَطِیفٌ لِّمَا یَشَاءُ**" [سورہ یوسف الآية: ١٠٠] **والحمدُ لِلّٰهِ**.

ص:۹-۱۰ اب حق تعالیٰ شانہ کو منظور ہے تو کسی وقت جس کے علم سے ہم قاصر ہیں احباب ومکرمین [ص:۹] کی خدمت میں پہونچ کر اپنی کوشش کو پیش کردیں گے اگر ہماری یہ

ص:۶ اب حق تعالیٰ کو منظور ہے تو انہی احباب مکرمین کی خدمت میں اس ترجمہ کو پیش کرکر تفصیلی نظر کی درخواست کریں گے اگر ہماری یہ پیوندکاری ان حضرات کے

پیوندکاری کسی درجہ میں مناسب اور مفید سمجھی گئی تو باذن اللہ شائع بھی ہوجاوے گا ورنہ مجبوراً جہاں ہے وہیں رہے گا۔

ص:۱۰ اس کے بعد ضروری ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اصل ترجمہ کی نسبت اور اپنی ناچیز ترمیم کے متعلق چند مختصر مفید باتیں عرض کردی جاویں جن سے بالاجمال دونوں کی حالت اور کیفیت بھی معلوم ہوجاوے۔

ص:۱۰ رفع ہوجاویں۔

// سو دیکھ لیجئے حضرت ممدوح نے اپنے ترجمہ کی بابت اتنا مضمون تو خود تحریر فرمادیا ہے کہ ہندی اور عربی زبان کا محاورہ موافق نہیں اس لئے اگر قرآن شریف کی ترتیب کے ہر ہر لفظ کا جدا جدا ترجمہ کیا جاوے تو ہندیوں کی سمجھ میں آنا دشوار ہو، سو اس وجہ سے ہم نے مجموعۂ آیت کی پابندی کی ہے ہر ہر لفظ کی پابندی نہیں کی یعنی ہندی محاورہ کے موافق ترجمہ کیا ہے تحت لفظی نہیں کیا۔

نزدیک مفید و مناسب سمجھی گئی تو انشاء اللہ شائع بھی ہوجاوے گا ورنہ مجبوراً جہاں ہے وہیں رہے گا۔شعر

گونالہ نازسا ہونہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہوسکا

ص:۶ اب اس کے بعد مناسب ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اصل ترجمہ کی بابت اور نیز اپنی ترمیم کے متعلق چند ضروری مفید باتیں عرض کردی جاویں جن سے دیکھنے والوں کو بالاجمال دونوں ترجموں کی حالت اور کیفیت بھی معلوم ہوجاوے۔

ص:۶ دفع ہوجاویں۔

// سو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شروع میں اپنے ترجمہ کی نسبت اتنا مضمون تو خود فرمادیا ہے کہ ہندی اور عربی زبان کا محاورہ ہرگز موافق نہیں، اس لئے اگر قرآن شریف کی ترتیب کے موافق ہر ہر لفظ کا جدا جدا ترجمہ کیا جاوے یعنی تحت لفظی تو ہندیوں کی سمجھ میں آنا دشوار ہو اس لئے ہم نے مجموعۂ آیت کی پابندی کی ہے ہر ہر لفظ کی پابندی نہیں کی یعنی ہندی محاورہ کے موافق ترجمہ کیا ہے تحت لفظی نہیں کیا۔

ص:۱۰-۱۱ کیونکہ اس ارشاد سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ حضرت ممدوح ہر ہر لفظ کی پابندی نہ کریں گے البتہ مجموعہ آیت کی پابندی کرنی ضرور ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہر ہر لفظ کی عدم پابندی کی کیا حد ہے اور تقدیم وتاخیر یعنی خلاف ترتیب کو کس حد تک جائز رکھا ہے صرف بقدر ضرورت الفاظ کو کچھ آگے پیچھے کرلیا ہے یا مجموعۂ آیت کے احاطہ میں محدود رہ کر پھر کسی تقدیم وتاخیر کی پرواہ نہیں کی تھوڑی ہو یا بہت ضروری ہو یا غیر ضروری ایک تغیر ہو یا متعدد۔ علاوہ ازیں حضرت ممدوح نے اس امر کو اجمالاً اور اشارۃً بھی نہیں بتلایا کہ ہم نے اپنے [ص:۱۰] ترجمہ میں کس کس امر کی رعایت رکھی ہے اور کن کن فوائد کا لحاظ اور التزام کیا ہے سواحقر ان دونوں باتوں کو مفید سمجھ کر ان کی نسبت کچھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

ص:۶ اس ارشاد سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ حضرت ممدوح اپنے ترجمہ میں ہر ہر لفظ کی پابندی نہ کریں گے ہاں آیت کی پابندی ضروری ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس عدم پابندی کی کیا حد ہے اور کہاں تک اس عدم پابندی کو حضرت ممدوح نے اپنے ترجمہ میں اختیار اور استعمال فرمایا ہے اور کتنی تقدیم وتاخیر کو جائز رکھا ہے یعنی بقدر ضرورت و حاجت کسی لفظ کو آگے یا پیچھے کرلیا ہے، یا صرف آیت کے احاطہ میں رہ کر پھر کسی تقدیم وتاخیر کی پرواہ نہیں کی تھوڑی ہو یا زیادہ ضروری ہو یا غیر ضروری ایک تغیر ہو یا متعدد۔ اس کے سوا حضرت شاہ صاحب نے یہ امر اجمالاً بھی نہیں بیان کیا کہ ہم نے اپنے ترجمہ میں کس کس امر کا خیال رکھا ہے اور اس میں کیا کیا خوبیاں اور فوائد ہیں سواحقر ان دونوں باتوں کو مفید سمجھ کر ان کی نسبت کچھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

ص:۱۱ مگر احتیاطاً اول یہ عرض کئے دیتا ہے کہ ان ہر دو امر کے متعلق جو کچھ عرض کیا جاوے گا وہ موضح قرآن ہی سے مستنبط ہوگا، ظاہر ہے کہ اس کے سوا ہمارے پاس ذریعہ علم اور کیا ہے۔

ص:۶ سو یہ بات تو سب پر ظاہر ہے کہ احقر اس کے متعلق جو کچھ بھی عرض کرے گا وہ موضح قرآن ہی کی عبارت سے مستنبط ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے لئے اور کیا امر ذریعہ علم ہوسکتا ہے۔ [ص:۶]

ص:۱۱ اوراس کی مثال بعینہٖ ایسی سمجھئے جیسا علماء کرام نے خاتم المحد ثین حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی خود کتاب صحیح بخاری سے استنباط فرما کر ان کے اصول وقواعد، شروط وقیود، اغراض ومقاصد کو بیان کردیا ہے۔	ص:۷ بعینہٖ جیسا کہ حضرات علماء کرام نے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی خود کتاب صحیح بخاری سے استنباط کر کے ان کی شروط وقیود واغراض کو بیان فرمادیا ہے۔
؍؍ البتہ صرف اتنی بات ضروری ہے کہ ہم جس امر کو حضرت ممدوح کی طرف منسوب کریں اس کا مأخذ موضح قرآن میں دکھلا دیں اس کے بعد نہ کسی قسم کے خلجان کا موقعہ نہ کسی شبہ کی گنجائش، بہت سے بہت ممکن ہے تو یہ ہے کہ ہم اپنے فہم کے موافق حضرت ممدوح کے کسی خفیف اشارہ سے جو بات سمجھیں کسی کی رائے میں وہ ہمارا وہم سمجھا جاوے۔ سواول تو یہ امر نہ ہم سے مستبعد نہ ہم کو اس سے انکار بلکہ بشرط اطلاع وانصاف انشاء اللہ مشکوری کے ساتھ تسلیم کرنے کو حاضر ہیں۔ دوسرے چونکہ وہم انسان کے اوصاف لازمہ میں سے ہے ادھر بوجہ اختلاف فہم وذوق اشارات لطیفہ کے سمجھنے میں طبائع میں اختلاف ہے نیز بوجہ غلبہ وہم جب امر موہوم	؍؍ یہ عبارت نقل میں نہیں ہے۔

کسی کو محقق نظر آنے لگتا ہے اسی طرح کسی کو امر محقق بوجہ قلت تدبر موہوم معلوم ہوتا ہے ان وجوہ سے اس کھٹکے سے کسی کو بھی بالکل مطمئن ہونا ٹھیک نہیں والانصافُ خیرٌ من الاعتساف.

ص:۱۱-۱۲ اس کے بعد امر اول کی نسبت تو یہ عرض ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو باوجود پابندی محاورات[ص:۱۱] ترتیب قرآنی کا ہر موقع پر لحاظ رہتا ہے اور اس کی رعایت میں ہرگز تساہل نہیں فرماتے یہ نہیں کہ محاورات کے التزام کی وجہ سے ترتیب قرآنی کے اہتمام میں کوتاہی ہوجاوے کیوں کہ اول تو ترجمہ کی اصل یہی ہے کہ حتی الامکان مطابق اصل ہو، دوسرے حضرت ممدوح ومرحوم کا ارشاد جو ابھی گذرا اس سے بھی مترشح ہے کہ اصل اور ترجمہ میں موافقت ہونی چاہئے، ورنہ عذر فرمانے کی حاجت کیا تھی ان دونوں وجہوں کے بعد اس امر کی کھلی اور قوی دلیل خود موضح قرآن سامنے ہے اس کے مطالعہ سے صاف نظر آتا ہے کہ حضرت ممدوح نے ترتیب قرآنی کی کس درجہ رعایت ہر جگہ ملحوظ رکھی ہے اور اس میں

ص:۷ سوامر اول کی نسبت یہ عرض ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ ترتیب قرآنی کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اصل اور ترجمہ کی مطابقت میں بہت زیادہ سعی فرماتے ہیں مگر چونکہ ترجمہ بامحاورہ کا التزام کیا ہے اس لئے بضرورت توضیح وتسہیل بعض مواقع میں تقدیم وتاخیر لازم ہے مگر جیسا کہ آٹے میں نمک یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اول اور اول کا آخر ہوجاوے الغرض فصل بعید سے احتراز رکھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، کسی خاص ضرورت کے وقت میں دوتین کلموں کا فصل ہوجاوے اور وہ بھی النادر کالمعدوم.

کتنے تغیر کو اور کس ضرورت سے روا رکھا ہے سوترجمہ موصوف کے مطالعہ سے بالبداہہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ممدوح ترتیب قرآنی کے محفوظ رکھنے میں ہرگز ہرگز کوتاہی نہیں فرماتے صرف اس ضرورت سے کہ بوجہ ضرورت مذکورہ بالا ترجمہ بامحاورہ کا التزام فرمایا ہے تقدیم تاخیر کرنی ضروری ہے مگر جیسا کہ آٹے میں نمک اور اُرد پر سفیدی اور وہ بھی بقدر حاجت۔ یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اول اور اول آیت کا آخر ہوجائے۔ فصل بعید سے بہت احتیاط رکھتے ہیں اِلّا ماشاء اللہ کسی خاص ضرورت سے دو تین کلموں کا فصل ہوجاوے اور وہ بھی شاذ ونادر۔	
ص:۱۲-۱۳　یہ مختصر بات بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت ممدوح کو چونکہ محاورات کا بتلانا ہرگز مقصود نہیں بلکہ محاورات کے ذریعہ سے معنی اور مطلب قرآن کا بسہولت عوام کو سمجھانا مقصود ہے اس لئے موضح میں محاورات برابر ہر جگہ معنی قرآن کے تابع نظر آتے ہیں اور مقدار حاجت سے زائد بہ تکلف محاورات کو ٹھونسا موضح میں کہیں نہ ملے گا اور جن کا مبلغ [ص:۱۲] پرواز اور مایۂ ناز یہی	ص:۷　یہ عبارت نقل میں نہیں ہے۔

ہے اُن صاحبوں نے جابجا الفاظ محاورات کو ٹھونس ٹھونس کر بعض مواقع میں تو بجائے سہولت الٹا اشکال بڑھادیا ہے اور بعض مواقع میں یہ غضب کیاہے کہ معنی اصلی اورواقعی ہی بالکل بدل کر کچھ کے کچھ ہو گئے اورمحاورہ کے شوق میں اس قباحت وشناعت کی ان کو کچھ پرواہ نہ ہوئی یایوں کہو تمیز نہیں ہوئی۔فالحذر، الحذر.

ص:۱۳-۱۴ بالجملہ بلاوجہ وجیہ مخالفت ترتیب سے احتراز فرماتے ہیں اور قدر حاجت سے زائد کو روانہیں رکھتے مثلاً زبان عرب میں مضاف کومقدم ذکر کرتے ہیں اور محاورہ اردو میں مضاف الیہ کو پہلے لاتے ہیں وہ ''غلام زید'' کہتے ہیں تو یہ ''زید کا غلام'' بولتے ہیں سوترتیب تو بدل گئی مگر اول تو محاورہ کی مجبوری دوسرے تغیر نہایت قلیل جس سے اتصال زائل نہیں ہوا،اور دونوں کلموں میں فاصلہ کچھ نہیں ہوا اس لئے حاجت کے وقت یہ خفیف اختلاف قابل لحاظ نہ ہوگا اس کی مثالیں ترجمہ موصوف میں جگہ جگہ ملیں گی اور تحت لفظی ترجمہ میں چونکہ یہ مجبوری نہیں اس لئے یہ تغیر ترجمہ لفظی میں نظر نہ آئے گا۔مگر

ص:۷ دیکھئے عربی زبان میں مضاف کومقدم ذکر کرتے ہیں اوراردو کا محاورہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کومقدم کرتے ہیں وہ ''غلام زید'' کہتے ہیں تو ان کے محاورہ میں زید کا غلام کہیں گے سوترتیب تو بدل گئی مگر دونوں کلمے متصل ہی رہے فاصلہ اورفرق کچھ نہیں ہوا۔اس لئے حاجت کیوقت یہ تغیر کچھ تغیر نہیں سمجھا جاتا۔اس قسم کی مثالیں شاہ صاحب کے ترجمہ میں کثرت سے ملیں گی مثلاً **عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وعَلٰیٓ اَبْصَارِهِمْ**[سورۃ البقرہ الآیۃ:۷] کا ترجمہ بامحاورہ کریں گے تو ان کے دل پر اوران کے کان پر اوران کی آنکھوں پر کیا جاوے گا اور ترجمہ تحت لفظی

سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلافات جتنے بھی ہوں ترجمہ بامحاورہ میں جائز بلکہ ضروری سمجھے جائیں گے حتی کہ اگر بامحاورہ ترجمہ میں یہ اختلافات نہ ہوں تو وہ ترجمہ بامحاورہ نہ سمجھا جاوے گا اور بامحاورہ ترجمہ میں اس قسم کے جتنے کثرت سے اختلافات ہوں گے اسی قدر اس کے بامحاورہ ہونے کی تصدیق اور اس کی خوبی سمجھی جاوے گی۔ مگر حضرت ممدوح اس پر بھی مضاف الیہ کو ہر جگہ مقدم نہیں لاتے بلکہ جہاں گنجائش مل جاتی ہے وہاں بوجہ عدم ضرورت اس قلیل تغیر کو بھی ترک فرما کر ترتیب قرآنی ہی کو قائم رکھتے ہیں، مثلاً اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [سورۃ الفاتحۃ الآیۃ:۱] میں چوں کہ رَبِّ الْعٰلَمِيْن مضاف ص:۱۳۰] اور مضاف الیہ صفت واقع ہیں تو اس کے ترجمہ میں یہ گنجائش نکل آئی کہ ترجمہ ترتیب قرآنی کے مطابق بھی رہے اور محاورہ کے خلاف بھی نہ ہو اور ایسے نظائر بکثرت ملیں گے۔

میں او پر دلوں ان کے کے اور او پر کانوں ان کے کے اور او پر آنکھوں ان کی کے کہنا پڑے گا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلاف جتنے بھی ہوں ان میں کوئی حرج نہیں بلکہ ضروری ہیں بامحاورہ ترجمہ کرنے والے کو اس سے مفر نہیں لیکن حضرت شاہ صاحب کی احتیاط قابل تحسین اور لائق قدر ہے کہ اس پر بھی ہر جگہ مضاف الیہ کو مقدم نہیں کرتے بلکہ جہاں ترجمہ میں ذرا گنجائش مل جاتی ہے وہاں اتنے قلیل تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے ترتیب قرآنی ہی کو اختیار فرماتے ہیں دیکھو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ [سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ:۱] میں چونکہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ مضاف مضاف الیہ مل کر صفت واقع ہوئے ہیں اس کے ترجمہ میں یہ گنجائش نکل آئی کہ ترجمہ محاورہ کے خلاف بھی نہ ہو اور کلام الٰہی کی ترتیب بھی باقی رہے اس لئے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا ترجمہ اصلی ترتیب پر رکھا اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ [سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ:۳] بھی صفت واقع ہوا ہے مگر اس میں دو اضافتیں مجتمع ہیں اول اضافت میں اصلی ترتیب باقی

رکھنے کی گنجائش ہے دوسری اضافت میں نہیں اس لئے ترجمہ میں مالک کا ترجمہ اصل کے موافق مقدم رکھا اور یوم کے ترجمہ کومحاورۃ اردو کے موافق ''دین'' سے مؤخر کردیا چنانچہ سب پر ظاہر ہےاس میں کسی کو تردد نہیں صرف توضیح اور تسہیل کی غرض سے ہم نے عرض کردیا، لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں کہ وہاں محاورہ اردو کے ساتھ ترتیب قرآنی کالحاظ رکھنا دشوار ہے، حضرت شاہ صاحب ان مقامات میں بھی اپنی غائر اور باریک بیں نظر سے ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں کہ محاورہ کی پابندی کے ساتھ ترتیب بھی باقی رہے یافرق آوے تو خفیف ولطیف۔

ص:۱۴　خلاصہ یہ کہ پابندی محاورہ تو ضروری ہے اوراس ضرورت سے جوخلاف ترتیب کرنا پڑے وہ مستثنیٰ اور مستحسن اورضروری ہے باقی اس ضرورت کے علاوہ خلاف ترتیب کو ہرگز اختیار نہیں فرماتے بلکہ مثل ترجمہ تحت لفظی موافقت ترتیب کولازم وواجب سمجھتے ہیں۔

ص:۷　یہ عبارت نقل نہیں ہے۔

ص:۱۴-۱۵　یہی حال ہے فعل او رمفعول اوردیگر متعلقات فعل اورصفت، موصوف، حال، تمیز

ص:۷　بعینہٖ یہی حال ہے فعل ،اورفاعل اور مفعول اورجمیع متعلقات فعل کا اورصفت،

وغیرہ کا کہ اکثر مواقع میں ترتیب قرآنی کی متابعت فرماتے ہیں اور بعض مقامات میں بوجہ رعایت محاورہ وسہولت اسی تغیر خفیف مذکورہ بالا سے کام لیتے ہیں۔ اور لیجئے حروف ربط جن کو حروف جر کہتے ہیں جگہ جگہ بکثرت مستعمل ہیں، جیسے لام، با، کاف، علیٰ، الی، من، عن، فی وغیرہ اور کلام عرب میں یہ حروف ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں لیکن ہماری زبان میں عموماً مؤخر بولے جاتے ہیں مگر قلیل ونادر۔ سوان حروف میں بعض حروف تو ایسے ہیں کہ ان کا ہماری زبان میں مؤخر ہونا ایسا ضروری ہے کہ مقدم لانے کی کوئی صورت ہی نہیں جیسے من اور عن۔ کلام اردو میں ممکن نہیں کہ من اور عن کا ترجمہ ان کے معمول سے مقدم ہوسکے، اور ترتیب قرآنی کی موافقت کرسکیں۔ اسی وجہ سے ترجمہ تحت لفظی میں بھی یہ تغیر اور اختلاف بہ مجبوری قبول کرنا پڑتا ہے باقی اکثر حروف ایسے ہیں کہ ان کو ہماری زبان میں مقدم کرنا گو جائز ہے مگر محاورہ کے خلاف ہے جیسے: الیٰ، علیٰ، فی وغیرہ، سوان کو ترجمہ [ص:۱۴] تحت لفظی میں تو نظم قرآنی کے موافق مقدم لاویں گے لیکن بامحاورہ ترجمہ

موصوف، حال، تمیز وغیرہ کا کہ اکثر مواقع میں ترتیب کی موافقت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں اسی تغیر لطیف مذکورہ بالا سے کام لیتے ہیں، اور سنئے حروف روابط جن کو حروف جر بھی کہتے ہیں جیسے: لام، با، علی، الیٰ، من، عن، فی، بہت کثرت سے مستعمل ہیں مگر کلام عرب میں یہ حروف ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں اور ہمارے محاورہ میں علی العموم مؤخر بولے جاتے ہیں مگر شاذ ونادر لیکن ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا مؤخر ہونا ضروری ہے ہماری زبان میں ان کو مقدم لانے کی کوئی صورت ہی نہیں جیسے: من اور عن سب کو معلوم ہے کہ **مِمَّارَزَقْنٰهُم** [سورة البقرة، الآية:٣] کے ترجمہ میں اردو زبان کے اندر ممکن نہیں کہ من کا ترجمہ مقدم ہوسکے اور ترتیب قرآنی کی موافقت کی جاسکے۔ ایسے ہی **لَاتَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ** [سورة البقرة، الآية:٤٨] کے ترجمہ میں کوئی صورت نہیں کہ عن کا ترجمہ نفس کے ترجمہ سے مقدم ہوسکے اسی وجہ سے تحت لفظی ترجمہ میں بھی یہ تغیر گوارا کرنا ہوتا ہے

میں ان کو بھی مثل قسم سابق مؤخر لانا پڑے گا، مگر اس برائے نام اختلاف کو بھی بامحاورہ ترجمہ میں ایسا ہی مقبول سمجھنا چاہئے جیسا اختلاف سابق ہر ایک اردو ترجمہ میں مقبول تھا کیونکہ یہ حروف اول تو فی نفسہٖ غیر مستقل اور تابع محض ہیں صرف ان کا تقدم تاخر بھی کوئی مستقل اختلاف اور قابل اعتبار نہیں ہے، دوسرے بے وجہ نہیں بلکہ بوجہ ضرورت مسلمہ اختیار کرنا پڑا ہے حتی کہ محاورہ اردو میں اس کی مخالفت کی گنجائش ہی نہیں تیسرے اتنا لطیف وخفیف اختلاف ہے کہ جس سے اتصال میں فرق نہیں آیا اور ان سب امور کے بعد پھر وہی بات ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں یعنی جہاں کچھ گنجائش ہوتی ہے وہاں اس خفیف تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ترتیب قرآنی کی رعایت فرماتے ہیں اور ایسا ترجمہ اختیار کرتے ہیں جو ترتیب قرآنی او رمحاورہ دونوں کے موافق ہو۔ اس کی مثالیں حروف مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں مثلاً اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ[سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۴۵] کا ترجمہ ’’مگر ان ہی پر جن کے دل پگھلے ہیں‘‘ فرمایا ہے جس میں لفظ ’’علی‘‘ کا ترجمہ اور اس میں کسی کو تامل نہیں ہوسکتا۔ اور بعض ایسے ہیں کہ ان کو مقدم کرنا تو درست ہے مگر محاورہ کے خلاف ہے سو تحت لفظی ترجمہ میں ان کو نظم قرآنی کے موافق مقدم لا سکتے ہیں، مگر بامحاورہ ترجمہ کیلئے ان کو بھی مؤخر کرنا ضرور ہوگا، جیسے: علی، الیٰ وغیرہ حروف مذکورہ۔ دیکھئے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ[سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۷] کے تحت لفظی ترجمہ میں ’’ مہر کر دی اللہ نے اوپر دلوں ان کے کے‘‘ کہنا مناسب ہوگا اور بامحاورہ ترجمہ میں ’’مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر‘‘ کہنا ٹھیک سمجھا جاوے گا، پہلی صورت میں لفظ ’’عـلٰی ‘‘ اپنی اصلی ترتیب پر رہا دوسری صورت میں تھوڑا سا بقدر ضرورت اپنی جگہ سے ہٹ گیا اسی پر دیگر حروف کو قیاس فرما لیجئے سو اول تو یہ حروف فی نفسہٖ غیر مستقل اور دوسروں کے تابع ہیں ان کا تقدم تاخر چنداں قابل اعتبار نہیں دوسرے بے وجہ نہیں بلکہ ضرورت اور حاجت اور نفع کی وجہ سے کرنا ہوا تیسرے اتنا لطیف وخفیف کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی بعض مواقع میں قابل قبول اور ضروری سمجھا جاتا ہے ان

خاشعین کے ترجمہ سے مقدم ہے اور محاورہ کے بھی مطابق ہے۔

سب کے بعد پھر وہی بات ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں یعنی جہاں کچھ گنجائش نکل آتی ہے وہاں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ اس خفیف قابل قبول تغیر کو بھی چھوڑ کر اصلی ترتیب کو قائم رکھتے ہیں اور ایسا ترجمہ کرتے ہیں جو ترتیب قرآنی کی پابندی کے ساتھ محاورہ کے بھی مخالف نہ ہونے پاوے اس کی مثالیں حروف مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں مثلاً **اِلَّا عَلَی الخٰشِعِینَ** [سورة البقرة،الآية:٤٥] کا ترجمہ یہ فرمایا ”مگر ان ہی پر جن کے دل پگھلے ہیں“ یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں دیکھ لیجئے لفظ **علی** کے ترجمہ کو مقدم رکھا **خاشعین** پر اور محاورہ کے مخالف بھی نہیں ہوا۔

ص:۱۵-۱۶　بالجملہ موضح قرآن میں جو جگہ جگہ وہ تغیرات نظر آتے ہیں جو ترجمہ تحت لفظی میں نہیں پائے جاتے ان کی وجہ سے بشرط فہم وانصاف نہ موضح قرآن میں کسی خدشہ اور شبہ کی گنجائش ہے اور نہ ان کو حجت بنا کر ترجمہ بامحاورہ میں تقدیم وتاخیر کا دروازہ کھول دینا مناسب ہے جگہ جگہ تغیر اور اختلاف کا نظر آنا

ص:۷　یہ عبارت نہیں ہے۔

اہل فہم کے نزدیک ہرگز قابل لحاظ نہیں

[ص:۱۵] قابل لحاظ ہے تو یہ ہے کہ........

ص:۱۶ حضرت ممدوح جو تغیر کرتے ہیں وہ نہایت بجا تلا عند الحاجۃ اور بقدر ضرورت جس کی وجہ سے ترجمہ موضح قرآن جیسے التزام اور خوبی محاورات میں بے نظیر ہے ویسا ہی باوجود پابندی محاورات علت تغیر اور خفت تبدل میں بیعدیل ہے سواب ہم کو یہ دیکھنا نہ چاہئے کہ حضرت ممدوح نے کتنے مواقع میں تغیر کیا بلکہ اہل فہم کے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تغیر کیوں کیا اور کتنا تغیر کیا۔

البتہ ان معمولی مذکورہ بالا اختلافات کے سوا بھی بعض بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں محاورہ اردو کے ساتھ ترتیب قرآنی کو قائم رکھنا دشوار ہے یا ترتیب کی رعایت سے معنی میں اِغلاق پیدا ہوتا ہے۔ سو حضرت ممدوح ان مقامات میں بھی بہ نظر غائر ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں کہ محاورہ اور ترتیب دونوں کی رعایت ہو یا فرق آوے تو خفیف، اور معنی بھی مغلق نہ ہوں ان کے علاوہ بہت سے تصرفات خفیفہ اور بھی کر جاتے ہیں مثلاً بضرورت ایضاح کہیں مختصر لفظ ترجمہ میں بڑھا دیا یا کہیں مرجع

〃 الحاصل حضرت شاہ صاحب جگہ جگہ ترتیب میں تصرف کرتے ہیں مگر بجا تلا بقدر ضرورت اور عند الحاجت نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ جس کی وجہ سے حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کا ترجمہ جیسے استعمال محاورات میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے ویسا ہی باوجود پابندی محاورہ قلت تغیر اور خفت تبدل میں بھی بے مثل ہے، **فللّٰہ درہ ثم للّٰہ درہ**. اس کے سوا بعض بعض تصرفات خفیفہ مفیدہ اور بھی کرتے ہیں مثلاً ترجمہ میں کوئی لفظ مختصر بڑھا دیتے ہیں جس سے مطلب واضح ہو جاوے یا مراد خداوندی معین ہو جاوے سو یہ امر ایسا ہے کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی اس کی نظائر موجود ہیں ایسا ہی ترجمہ میں بعض الفاظ کو چھوڑ بھی جاتے ہیں مثلاً بعض مواقع میں ''اِنَّ'' کا ترجمہ نہیں کرتے'' یَـــا اَبـــت ''کے ترجمہ میں ''اے میرے باپ'' نہیں کہتے، صرف ''اے باپ'' پر قناعت کر جاتے ہیں ''یَـــا بُـنَـیَّ'' کا ترجمہ ''اے میرے چھوٹے بیٹے'' کی جگہ فقط

ضمیر کو ظاہر کر دیا کہیں لفظ مقدر کی تصریح فرمادی علی ہذا کبھی ترجمہ میں بعض الفاظ کو چھوڑ بھی جاتے ہیں، مثلاً بعض جگہ ''انّ'' کا ترجمہ نہیں کرتے ''یــــا ابــــت'' کا ترجمہ ''اے باپ'' فرماتے ہیں ''اے میرے باپ'' نہیں فرماتے ایسے ہی ''یَـا بُنَیَّ'' کا ترجمہ ''اے میرے چھوٹے بیٹے'' کی جگہ صرف ''اے بیٹے'' فرمایا ہے ''یارب'' کا ترجمہ متعدد مواقع میں ''اے رب'' ذکر کیا ہے کبھی ضمیر کا ترجمہ چھوڑ جاتے ہیں کبھی صیغہ مبالغہ کے ترجمہ میں مبالغہ کو ذکر نہیں فرماتے وغیرہ وغیرہ۔ سو اس قسم کے خفیف تصرفات میں کوئی حرج نہیں۔ ان میں کے اکثر تصرفات تراجم لفظیہ تلک میں موجود ہیں۔

''اے بیٹے'' فرمایا ہے ایسا ہی یَــــــا رَبِّ کا ترجمہ ''اے رب'' متعدد مواقع میں اختیار فرمایا ہے۔ سو اس قسم کے تصرفات میں کچھ حرج نہیں ترجمہ لفظی تلک میں ان کی گنجائش ہے۔

ص:۱۶-۱۷ اب باقی رہا امر ثانی یعنی حضرت ممدوح نے ترجمہ میں کس کس امر کا خیال رکھا ہے سو [ص:۱۶] ترجمہ موصوف کے مطالعہ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ عامۃً ترجمہ میں چند امور کا التزام ولحاظ بہت ہے اختصار و سہولت ووضاحت اور الفاظ قرآنی کی لفظی ومعنوی مطابقت اور معنی مرادی یعنی غرض ومقصود کلام کی رعایت جس کی وجہ سے

ص:۷　اب باقی رہی دوسری بات کہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ میں کن کن امور کا خیال رکھا ہے اور اس میں کیا کیا فائدے ہیں، سو یہ بات تو ظاہر نظر آتی ہے کہ حضرت ممدوح عامۃً چند باتوں کا بہت لحاظ رکھتے ہیں، ترجمہ میں اختصار و سہولت اور الفاظ قرآنی کی لفظی اور معنوی موافقت اور صرف لغوی معنی پر بس نہیں بلکہ معنی

مدعا کلام الٰہی کے سمجھنے میں اعانت ملتی ہے ان امور کے علاوہ ترجمہ میں کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے کسی اجمال وابہام کا کھولنا مقصود ہوتا ہے کبھی کسی اشکال وشبہ سے بچنے کی غرض سے کوئی لفظ اختیار فرماتے ہیں بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں اور دوسری کی جگہ کچھ اور جس کی وجہ سے مطلب میں سہولت ہوجاتی ہے کبھی کوئی فائدہ جدید ترجمہ سے زائد بتلا جاتے ہیں بغرض سہولت ووضاحت کبھی مضمون ایجابی کو عنوان سلبی میں ادا فرماتے ہیں بہت سے مقامات میں نفی واثبات کا جدا جدا ترجمہ نہیں کیا بلکہ حصر جو اس سے مقصود ہے اس کو مختصر سلیس الفاظ میں محاورے کے موافق ادا فرمادیتے ہیں۔

حال وتمیز وبدل وغیرہ حتی کہ مفعول مطلق کے عنوان کی رعایت رکھتے ہیں اور محاورہ کے موافق۔ الغرض الفاظ ومعانی دونوں کے متعلق ہر طرح سے غور اور اہتمام سے کام لیا ہے اور مقاصد کی تسہیل میں سعی۔ اور احتیاط میں کوتاہی نہیں کی اہل فہم کو بشرط توجہ ہمارے معروضات کی صداقت ہر جگہ انشاءاللہ ملے گی اس سے زیادہ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔

مرادی اور غرض اصلی کا ہر موقع میں بہت لحاظ رکھتے ہیں اور ترجمہ میں کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں جس کی وجہ سے اگر کسی قسم کا اجمال اور اشکال ہوتو زائل ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں دوسری جگہ کچھ اور حالانکہ معنی لغوی اس لفظ کے ایک ہی ہیں مگر ہر مقام کے مناسب جدے جدے عنوان سے بیان فرماتے ہیں جس سے قرآن کی غرض اور مراد سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی سہولت اور وضاحت کی رعایت سے کبھی مضمون ایجابی کو عنوان سلبی میں ادا کرتے ہیں اور اکثر مواقع میں نفی اور استثناء کا جدا جدا ترجمہ نہیں کرتے بلکہ حصہ جو اس سے مقصود ہے اس کو مختصر ہلکے لفظوں میں محاورہ کے موافق بیان کرجاتے ہیں۔ حال، تمیز، بدل وغیرہ حتی کہ مفعول مطلق کے عنوانات کی رعایت رکھتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ اردو [ص:۷] کے محاورے کے موافق بالجملہ الفاظ اور معانی دونوں کے متعلق بوجوہ متعددہ بہت غور اور رعایت سے کام لیا گیا ہے اور مطالب ومقاصد کی تسہیل اور توضیح میں پورے خوض

ص:۱۷-۱۹ باقی ہمیں ہرگز ہرگز شبہ نہیں کہ حضرات علماء متدینین میں جس نے اس مبارک خدمت کوانجام دیاہے اس نے اپنے فہم ومذاق کے موافق اس قسم کے فوائد کاپورااہتمام کیاہے اور ہرطرح کی خوبی اوراحتیاط میں غورفرما کراس امرمہتم بالشان کوانجام دیاہے مگر بات یہ ہے [ص:۱۷] کہ فضائل وکمالات خداداد کے علاوہ حضرت ممدوح نے جس غورواہتمام سے اس خدمت کوانجام دیاہے وہ بےنظیر ہے ہرموقعہ میں چھوٹے بڑے لفظی معنوی امور کا اتناخیال رکھتے ہیں اوراُن امور کی اس قدر رعایت فرماتے ہیں کہ اکثر مقامات میں بے ارادہ کسی کاقول یادآجاتاہے۔

زفرق تا بقدم ہرکجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاایں جااست

اوراحتیاط کوملحوظ رکھاہے،ہم نے بغرض تنبیہ یہ چندباتیں مختصرطور سے عرض کردی ہیں، اہل فہم توجہ فرماویں گےتو انشاء اللہ ان کو ہماری عرض کی صداقت جگہ جگہ برابر ملے گی ہم کوکسی طول کی حاجت نہیں اور حاشا وکلا ہمارایہ مطلب ہرگز نہیں کہ فوائد مذکورہ کااورکسی نے خیال نہیں فرمایا۔

ص:۸ فضلائے معتبرین مشہورین وغیرہ علماء کے تراجم میں ہرایک نے اس قسم کےفوائدکا اپنی اپنی فہم اوررائے اور مصلحت اورگنجائش کے موافق ضرور خیال فرمایا ہے مگر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب ممدوح نے چونکہ ہر موقع پر ان چھوٹے بڑےفوائد متعددہ کی طرف پوری توجہ فرمائی ہےاورترجمہ میں ہرموقع پران کااہتمام رکھا ہے۔ اس لئے کمّاً اورکیفاً دونوں طرح یہ امورموضح قرآن میں زائد ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ موصوف جملہ تراجم میں ممتاز اور مفیدترنظر آتاہےاور بنظرفہم وانصاف اس کامستحق ہے کہ سہل ممتنع کے ساتھ ملقب ہو یہ حضرت ممدوح کاکمال ہے کہ ہرموقع پر جملہ امورپیش نظر رہتے ہیں اورترجمہ میں

اس لئے کماً وکیفاً اس قسم کے چھوٹے بڑے فائدے موضح قرآن میں زیادہ نظر آتے ہیں اور بلا مبالغہ سہل ممتنع کہنے کو دل چاہتا ہے۔

اسی کے ساتھ جب ہم خیال کرتے ہیں کہ حضرت ممدوح کے اس علمی وعملی کمالات پر ان کی تالیفات بجز موضح قرآن ہم کو نظر نہیں آتیں تو یہی دل میں آتا ہے کہ کسی قوی محرک نے حضرت ممدوح کو اس خدمت پر متوجہ کیا ہے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس خدمت کو اپنی آورد کے زور اور معمولی توجہ سے انجام نہیں دیا بلکہ جو کچھ کیا ہے وہ آمد کے جوش اور قلبی شوق سے کیا ہے چنانچہ احقر نے اپنے بعض مرحوم بزرگواروں سے سنا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس خدمت سے فارغ ہوگئے تو کسی کا شعر کچھ تصرف فرما کر اس طرح پڑھتے تھے۔

روز قیامت ہر کسے باخویش دارد نامۂ
من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآں در بغل

اور مناسبات اور متعلقات ترجمہ ہی میں منحصر نہیں بلکہ بعض مقامات میں حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے مبسوط حسب حاجت ان کی رعایت کرتے ہیں اور اسی کے مطابق الفاظ بھی ان کو بسہولت مل جاتے ہیں گویا محاورات ولغات اردو بھی سب سامنے رہتے ہیں جس کو مناسب سمجھا بے تکلف لے لیا۔ اور اس پر ترجمہ اپنے محدود احاطہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ **فبارك اللّٰه فی حسناته وافاض علینا من بركاته.** یہ بات کس قدر قابل قدر اور مفید ہے کہ حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے مبسوط ارشادات کا خلاصہ بسہولت ہر درجہ کے مسلمانوں کو ایک لفظ سے سمجھ میں آسکے بلکہ بعض مواقع میں تو حضرت شاہ صاحب کا ایک دو لفظ وہ کام دیتا ہے کہ مبسوط ارشادات سے احق بالقبول معلوم ہوتا ہے، **اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ** [سورة الروم الآية:٢٢].

اس موقع پر ارشاد خداوندی **فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا** [سورة الانبياء، الآية:٧٩] کا نقشہ اور نمونہ ناخواستہ سامنے آگیا۔ دیکھئے حضرت سلیمان علیہ السلام لڑکے تھے مگر حق سبحانہ نے اپنی رحمت سے ان کو وہ بات سمجھا

ارشادات کا خلاصہ ایک دو لفظ میں بسہولت بتلا جاتے بعض مواقع میں حضرت ممدوح کا ایک دو کلمہ مبسوط ارشادات سے احق بالقبول ہوتا ہے۔

دفع التباس اور رفع اشکال کا بہت خیال رکھتے ہیں اور باوجود ان امور کے ترجمہ [ص:۱۸] اپنے محدود احاطہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھنے پاتا، **اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِينَ**. [سورة الروم الآية:۲۲]

الحاصل تراجم معتبرہ میں غور کرنے سے اکرام **فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا** [سورة الانبياء، الآية: ۷۹] اور انعام **وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ** [سورة سبا، الآية: ۱۰] کا نقشہ ضرور نظر آتا ہے، **بارك الله فی حسناتهم و افاض علينا من فيوضهم و بركاتهم.**

ص:۱۹-۲۶ اس کے بعد بیشک اس امر کی ضرورت ہے کہ جیسے ہم نے یہ چند فوائد بلادلیل عرض کردیئے ہیں ایسے ہی کسی موقعہ سے چند مثالیں بھی عرض کردی جاویں تاکہ ہماری معروضات کے لئے موجب

دی کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی تسلیم فرمالیا اور اپنے حکم کو واپس کرلیا اور اس سے کسی کے علم وفہم میں کوئی نقصان اور اعتراض بھی نہ ہوا۔

شعر:....

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

حق تعالیٰ کے غیر متناہی خزانے ہیں جس کو جس میں سے چاہتے ہیں حصہ معین عنایت فرمادیتے ہیں۔ **وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ**.[سورة الحجر، الآية:۲۱].

〃 اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ چند فوائد عرض کئے ہیں ایسے ہی چند مثالیں بھی کسی موقع سے عرض کردی جائیں جن سے ہمارے معروضات کی تصدیق ہوجاوے اور ناظرین کے لئے تسکین اور

تصدیق ہو اور بطور نمونہ ترجمہ موصوف کی کچھ حالت معلوم ہو کر ناظرین کے لئے باعث اطمینان ہو۔ سو شروع ہی سے لیجئے اور جو بات ہماری معروضات میں مجمل ہو اس کو موضح قرآن میں ملاحظہ فرمالی جائے۔

دیکھئے بسم اللہ کا ترجمہ محاورہ کے موافق کیا ہے جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بقدر مناسب رعایت ملحوظ ہے اس سے بہتر اور سلیس و حسین ترجمہ اردو میں نظر نہیں آتا۔ اور رحمٰن اور رحیم جو مبالغہ کے صیغے ہیں ان کے مبالغہ کو بھی ظاہر فرمادیا اور دونوں کے فرق مراتب کی طرف بھی اشارہ لطیف کردیا، تراجم سابقہ میں بوجہ عدم ضرورت مبالغہ سے تعرض نہیں فرمایا۔

اس کے بعد سورۂ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ اسی کے مطابق کیا۔ یوم الدین کا ترجمہ اکثر حضرات نے ”روز جزا“ یا ”دن جزا“ فرمایا ہے مگر اول تو شاہ صاحب نے فرمادیا ہے کہ میں نے عوام کی بول چال میں ترجمہ کیا ہے اور عوام کی بول [ص:۱۹] چال میں جزا کا لفظ شائع نہیں۔ دوسرے اہل لغت اور علماء

اطمینان کا باعث ہو سو اول ہی سے لیجئے، دیکھئے بسم اللہ کا ترجمہ محاورہ کے موافق کیا جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بقدر مناسب رعایت ہے اس سے بہتر اور خوبصورت ترجمہ اردو میں سمجھ میں نہیں آتا اور ”رحمٰن“ اور ”رحیم“ جو مبالغہ کے صیغے ہیں ان کے مبالغہ بھی ظاہر فرمادیا اور لطیف اشارہ دونوں کے فرق مراتب کی طرف بھی کرگئے، جتنے تراجم سابقہ ہیں ان میں مبالغہ سے تعرض نہیں فرمایا۔ اس کے بعد سورۂ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا۔ یوم الدین کا ترجمہ جملہ حضرات نے روز جزا یا ”دن جزا“ کا فرمایا ہے مگر حضرت شاہ صاحب نے صاف لکھ دیا کہ میں نے عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور عوام کے کلام میں جزا کا لفظ شائع اور مستعمل نہیں دوسرے اہل لغت اور حضرات مفسرین نے دین کے معنی جزا اور حساب دونوں فرمائے ہیں ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے جزا کے بدلے ”انصاف“ کا لفظ اختیار فرمایا کہ عوام میں بھی شائع ہے اور اس ایک لفظ میں جزا اور حساب دونوں آگئے

مفسرین نے دین کے معنی ''جزا'' اور ''حساب'' دونوں تحریر فرمائے ہیں ان وجوہ سے غالبًا حضرت ممدوح نے ''جزا'' کے لفظ کو چھوڑ کر اس کے بدلے ''انصاف'' کا لفظ اختیار فرمایا کہ یہ لفظ عوام میں مشہور ہے اور اس ایک لفظ میں ''جزا'' اور ''حساب'' دونوں آ گئے۔

اهدنا الصراط ہدایت کا ذکر کلام الٰہی میں جگہ جگہ آتا ہے سو حضرات مترجمین اس کے ترجمہ میں اکثر تو لفظ ''ہدایت'' ہی فرما جاتے ہیں کیونکہ یہ لفظ فارسی، اردو، دونوں میں شائع ہے اور کبھی اپنی زبان میں ترجمہ فرماتے ہیں تو فارسی والے ''راہ نمائی'' سے اور اردو والے ''رستہ دکھلانے'' سے ترجمہ کرتے ہیں مگر حضرت ممدوح کی عادت ہے کہ اول تو علامۃ ترجمہ اپنی زبان میں فرماتے ہیں الا ماشاء اللہ۔ دوسرے چونکہ ہدایت کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک صرف ''رستہ دکھلانا'' دوسرے '' منزل'' مقصود تلک پہنچا دینا۔ اول کو ''اراءۃ'' دوسرے کو ''ایصال'' کہتے ہیں تو اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ ہر موقعہ پر اس کا بھی لحاظ رکھتے ہیں کہ ہدایت کے کونسے معنی مراد اور اس موقعہ کے مناسب ہیں اور اسی کے مناسب ''ہدایت''

اهدنا الصراط المستقیم . جملہ حضرات ہدایت کا ترجمہ کبھی تو لفظ ہدایت ہی سے کر جاتے ہیں اس لئے کہ لفظ ہدایت فارسی اردو میں برابر مستعمل ہے اور کبھی اپنی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں تو ہدایت کا ترجمہ راستہ دکھانے اور ''راہ نمائی'' کے ساتھ کرتے ہیں، مگر حضرت ممدوح علی العموم ہدایت کا ترجمہ اپنی ہی زبان میں فرماتے ہیں الا ماشاء اللہ لیکن ہر موقع پر اس کا بھی لحاظ رکھتے ہیں کہ ہدایت کے کونسے معنی اس موقع کے مناسب ہیں کیونکہ ہدایت کے لغت عرب میں دو معنی ہیں، ایک صرف راستہ دکھلا دینا دوسرے مقصود تلک پہنچا دینا، اول کو ''اراءت'' دوسرے کو ''ایصال'' کہتے ہیں۔ اس لئے اوروں نے اہدنا کا ترجمہ ''دکھا ہم کو'' فرمایا ہے اور شاہ صاحب ''چلا ہم کو'' فرماتے ہیں جس سے ایصال کی طرف اشارہ کرنا مفہوم ہوتا ہے اسی طرح پر **ھدی للمتقین** میں اور حضرات نے ''**ھدی**'' کے ترجمہ میں ''رہنما'' یا ''راہ دکھاتی ہے'' فرمایا ہے اور حضرت ممدوح نے ''راہ بتاتی ہے'' فرمایا ہے چونکہ **اھدنا** میں

کے ترجمہ میں کوئی لفظ اختیار فرماتے ہیں۔ ہرجگہ اس کے ترجمہ میں ''راہ دکھانا'' ہی نہیں فرماتے سواسی وجہ سے اور حضرات نے تواھدنا کا ترجمہ ''دکھا ہم کو'' فرمایا اور حضرت ممدوح نے ''چلا ہم کو'' فرما کر ایصال کی طرف اشارہ کردیا۔ اسی طرح ھُدیً للمتقین کے ترجمہ میں اور حضرات نے تو ''راہ دکھاتی ہے'' یا ''رہنما'' فرمایا اور حضرت ممدوح نے ''راہ بتاتی ہے'' پسند کیا، چونکہ [ص:۲۰] اھدنا میں ہدایت حق تعالیٰ کا فعل ہے تو وہاں چلانے کا لفظ مناسب ہے، ھدی للمتقین میں ہدایت قرآن کی صفت ہے تو یہاں بتانے کا لفظ چسپاں ہے ورنہ دونوں جگہ ایصال کی طرف اشارہ مقصود معلوم ہوتا ہے۔ **فرحمہ اللّٰہ ماادَقَّ نظرہ و ارَقَّ الفاظہ.**

اس کے بعد متقین میں حضرات مرحومین نے تقوی کا ترجمہ ''پرہیزگاری'' فرمایا ہے جو شریعت میں مشہور اور ظاہر کے مطابق اور تفاسیر کثیرہ کے موافق ہے۔ پھر حضرات مفسرین نے اس پر شبہ بیان فرمایا کہ ہدایت کے محتاج گمراہ ہیں نہ متقی و پرہیزگار،

ہدایت حق تعالیٰ کی صفت ہے تو وہاں چلانے کا لفظ لائے ہیں اور اس موقع میں ہدایت قرآن کی صفت تو اس لئے راہ بتانے کا لفظ بیان فرمایا ورنہ دونوں جگہ مقصود ایصال کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔ **فرحمہ اللّٰہ ماادق نظرہ و ارَقَّ الفاظہ.**

متقین میں تقویٰ کا ترجمہ سب حضرات مرحومین نے ''پرہیزگاری'' فرمایا ہے، جو تفاسیر کثیرہ کے موافق ہے پھر حضرات مفسرین نے اس پر شبہ کیا کہ ہدایت کے محتاج گمراہ ہیں نہ کہ متقی اس لئے ھُدی للضالین فرمانا چاہئے تھا، بعض حضرات نے مُتقین کے معنی صائرین الی التقویٰ کے لے کر جواب دیا بعض نے دیگر جوابات دے کر شبہ کا قلع قمع کیا حضرت شاہ صاحب کی طبع لطیف اور باریک بیں نظر اس طرف گئی کہ تقویٰ کا ترجمہ ''ڈر اور خوف'' کے ساتھ کرنا پسند کیا جو تقویٰ کے اصلی اور لغوی معنی ہیں اور متقین سے وہ لوگ مراد لئے جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، اس لئے ھُدیً لِّلْمُتَّقِیْنَ کا ظاہر اور معروف ترجمہ یعنی ''راہ دکھاتی ہے پرہیزگاروں

اس لئے ھدی للضالین فرمانا مناسب تھا، سو بعض حضرات نے متقین کے معنی ''صائرین الی التقویٰ '' لے کر جواب دیا بعض نے دیگر جوابات سے شبہ مذکورہ کا قلع قمع کیا مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر اس طرف گئی کہ تقویٰ کے اصطلاحی مشہور معنی چھوڑ کر اصلی اور لغوی معنی اختیار کئے اور متقین سے وہ لوگ مراد لئے جن کے قلوب میں حق تعالیٰ کا خوف ہے اس لئے ھدی للمتقین پر ظاہر اور معروف ترجمہ یعنی ''راہ دکھاتی ہے پرہیزگاروں کو'' اس کو چھوڑ کر ''راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو'' اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے شبہ مذکور کا موقعہ ہی نہ رہا جو کسی جواب کی حاجت ہو اور اگر ہدایت سے ایصال مراد لیویں جیسا کہ ترجمہ میں حسب معروضات سابقہ اس کی طرف لطیف اشارہ مفہوم ہوتا ہے تو پھر تو شبہ کیا کسی وہمی کے تو ہم کا بھی وہم نہیں ہوتا۔

اس کے بعد یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ [سورة البقرة، الآية:۳] کا ترجمہ ''ایمان لاتے ہیں ساتھ غیب کے'' یا ''غیب پر'' [ص:۲۱] بالکل درست اور ظاہر کے موافق ترجمہ ہے اور لفظ ایمان اور غیب چونکہ مشہور و معروف الفاظ ہیں اس

کو'' اس کو چھوڑ کر'' راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو'' اختیار فرمایا جس سے شبہ مذکورہ کے خطور کا موقع ہی نہ رہا جو کسی جواب کی حاجت ہو اور اگر ہدایت سے ''ایصال'' مراد لیں جیسا کہ ترجمہ میں اس کی طرف اشارہ مفہوم ہوتا ہے تو پھر تو شبہ کیا کسی وہمی کے تو ہم کی بھی گنجائش نہیں۔ آ گے دیکھئے: ''یومنون بالغیب'' کے ترجمہ میں اگر ''ایمان لاتے ہیں ساتھ غیب کے'' یا ''غیب پر'' کہا جاوے تو بہت صحیح اور ظاہر کے موافق ترجمہ ہے اور لفظ ایمان اور غیب دونوں ایسے مشہور ہیں کہ دوسرے لفظوں سے ان کے ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں لیکن لفظ ایمان اصطلاح شرع میں دو معنی میں مستعمل ہوتا ہے ایک نفس تصدیق اور یقین قلبی جو ضروریات دین کے ساتھ متعلق ہو جس کو حقیقت ایمانی سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور معنی لغوی کے بالکل مطابق ہے دوسرے تصدیق اور اعمال ایمانی کا مجموعہ جس کو ایمان کامل بھی کہتے ہیں سو اول تو حضرت شاہ صاحب کی عام عادت ہے کہ حتی الوسع ترجمہ میں اردو کے لفظ کو اختیار فرماتے ہیں۔

لئے دوسرے لفظوں سے ان کے ترجمہ کرنے کی حاجت نہیں۔

لیکن ایمان کا لفظ عرف شریعت میں دو معنی میں شائع ہے ایک نفس تصدیق ویقین وتسلیم قلبی جو کہ امور دین اور احکام شریعت کیساتھ متعلق ہو جس کو حقیقت ایمانی سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور معنی لغوی کے بھی موافق ہے۔ دوسرے تصدیق قلبی اور اعمال ایمانی دونوں کا مجموعہ جس کو ایمان کامل بھی کہتے ہیں۔ ادھر معروضات سابقہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ مترجم رحمہ اللہ کی عام عادت ہے کہ عوام کی بول چال میں ترجمہ کرتے ہیں اور جس لفظ کے معنی متعدد ہوتے ہیں وہاں ترجمہ میں ایسا لفظ لانا پسند فرماتے ہیں جس سے وہ معنی معین ہو جاویں جو مطلوب اور مناسب مقام ہوں، اس کے بعد غیب کے معنی بے شک ظاہر ہیں مگر اس کی تصریح نہیں کہ کس چیز سے غائب ہونا مراد ہے، سو ان باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مترجم ممدوح نے اُس صحیح اور مقبول ترجمہ کے بدلے جس کو ابھی عرض کر چکا ہوں یہ ترجمہ اختیار کیا ”یقین کرتے ہیں بن دیکھے“ ترجمہ ہلکا سلیس عام

دوسرے لفظ ایمان جب دو معنوں میں مستعمل ہے تو حضرت ممدوح کے اصول کے موافق ضرور ہوا کہ ترجمہ میں ایسا لفظ لاویں کہ ایمان کے جو معنی اس جگہ مراد ہیں ان کی تعیین ہو جاوے اور دوسرا احتمال نہ رہے علی ہذا۔ لفظ غیب میں اجمال ہے معلوم نہیں کس چیز سے غائب ہونا مراد ہے ان وجوہ سے وہ صحیح اور ظاہر ترجمہ جس کا پہلے ذکر ہو چکا اس کو چھوڑ کر یہ ترجمہ اختیار فرمایا ”یقین کرتے ہیں بن دیکھے“ جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ آیت میں ایمان کے اول معنی مراد ہیں نہ کہ دوسرے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غیب کے یہ معنی ہیں کہ جن چیزوں کو انہوں نے نہیں دیکھا اور ان کے علم و ادراک سے غائب ہیں جیسے دوزخ، بہشت، پل صراط، وزن اعمال، عذاب قبر، فرشتے، جنات، سو وہ لوگ ان سب چیزوں کا اللہ اور رسول کے فرمانے سے یقین کرتے ہیں، مع ہذا حضرات مفسرین رحمہم اللہ نے جو بالغیب میں چند احتمال ذکر فرمائے ہیں ان میں سے ایک معنی جو ظاہر اور راجح ہیں اس ترجمہ سے وہ بھی متعین ہو گئے جیسا کہ

فہم ہونے کے سوا ظاہر ہوگیا کہ یہاں ایمان کے اول معنی مراد ہیں نہ ثانی اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ غیب کا یہ مطلب ہے کہ جو چیزیں ان کی نظروں سے غائب ہیں یعنی ان پر اللہ اور رسول کے فرمانے سے یقین کرتے ہیں جیسے: بہشت ، دوزخ، پل صراط، وزن اعمال، عذابِ قبر، فرشتے، جنات، شیاطین وغیرہ وغیرہ۔

تنبیہ: ایمان کا ذکر قرآن شریف میں ماضی، مضارع، اسم فاعل، امر، نہی، [ص:۲۲] مختلف صیغوں کے ساتھ بکثرت موجود ہے سو حضرات مترجمین تو عام طور پر اس کا ترجمہ لفظ ''ایمان'' یا ''اسلام'' سے ذکر فرماتے ہیں کیونکہ دونوں لفظ معروف اور مشہور ہیں مگر حضرت ممدوح ''یقین''، ''ماننا'' ''اسلام''، ''ایمان'' جس لفظ کو کسی وجہ ظاہری یا مخفی سے مناسب مقام دیکھتے ہیں ہر جگہ اس کی رعایت فرماتے ہیں جس کی وجہ سے کارآمد اور مفید باتیں ترجمہ سے زائد بسہولت معلوم ہوجاتی ہیں، جیسا ابھی عرض کر چکا ہوں اور انہیں چھوٹے چھوٹے فرقوں اور ہلکی ہلکی رعایتوں کی وجہ سے بڑے بڑے خلجان اور لمبی لمبی بحثیں

کتب تفسیر میں مذکور ہے۔[ص:۸]

ص:۹ **تنبیہ:** ایمان کا ذکر قرآن شریف میں، ماضی، مضارع، امر، اسم فاعل مختلف صیغوں کے ضمن میں بہت کثرت سے موجود ہے، سو حضرات مترجمین تو اکثر مواقع میں اس کا حسب ظاہر ترجمہ ایمان یا اسلام سے فرما جاتے ہیں اور حضرت ممدوح ایمان، اسلام، یقین، ماننا جو لفظ جس موقع کے مناسب اور مفید سمجھتے ہیں اس کو اختیار کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ترجمہ کے متعلق کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ **يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ** [سورة البقرة الآية:٣] کے ترجمہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اور انہیں چھوٹے چھوٹے فرقوں اور ہلکی ہلکی رعایتوں کی وجہ سے بعض مواقع میں بڑے بڑے شبہے

بسہولت کبھی طے ہوجاتی ہیں اور تحقیقی بات معلوم ہوجاتی ہے مثلاً احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ جب آیت کریمہ **اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَلَم یَلْبِسُوا اِیْمَانَھُم بِظُلْمٍ اُوْلٰئِكَ لَھُمُ الاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُونَ** اَلخ[سورة الانعام الآية:۸۳] نازل ہوئی تو صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر نہایت شاق ہوئی اوران کو خلجان شدید پیدا ہوا آخر آپ کی خدمت میں عرض کیا ''**اینا لم یظلم نفسه**'' یعنی یارسول اللہ ہم میں ایسا کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو یعنی اس سے کوئی گناہ نہ ہوا ہو مطلب یہ کہ پھر اب تو ہم سب عذاب الٰہی سے غیر مامون اور ہدایت سے محروم ہوگئے آپ نے فرمایا ''**لیس ذلك انماھو الشرك الم تسمعوا قول لقمان لابنه یابنی لاتشرك باللّٰه ان الشرك لظلم عظیم**'' یعنی آیت میں ظلم سے ظلم عظیم مراد ہے جو شرک ہے مطلق گناہ مراد نہیں جو یہ خلجان پیش آوے۔

تو اس ارشاد سے وہ اشکال تو مرتفع ہوگیا جو صحابہ کرام کو موجب پریشانی ہوا تھا اور آیت کا واقعی مطلب بالاجمال سمجھ میں آگیا مگر یہ بات

بسہولت دفع ہوجاتے ہیں اور تحقیقی باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ دیکھئے احادیث میں وارد ہے کہ جب آیت کریمہ **اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَلَم یَلْبِسُوا اِیْمَانَھُم بِظُلْمٍ اُوْلٰئِكَ** اَلخ[سورة الانعام الآية:۸۳] نازل ہوئی تو حضرت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بہت ہی شاق گذرا، آخر آپ کی خدمت میں عرض کیا ''**اینا لم یظلم نفسه**''، یعنی یارسول اللہ ہم میں ایسا کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم یعنی گناہ نہ کیا ہو۔ تو پھر اب تو سب عذاب الٰہی سے غیر مامون اور ہدایت سے محروم ہوگئے۔ آپ نے فرمایا **لیس ذلك انماھو الشرك الم تسمعوا قول لقمان لابنه**''**یابنی لاتشرك باللّٰه ان الشرك لظلم عظیم**'' یعنی **لم یلبسوا ایمانھم بظلم** میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ مطلق گناہ نہیں جو یہ دشواری پیش آوے۔ حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے اقوال اس جواب کی تقریر میں مختلف ہوگئے جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے۔

سوا یک خلجان تو **لَمْ یَلْبِسُوا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ** میں تھا جو حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ

معلوم نہیں ہوئی کہ ارشاد فیض بنیاد کا ماخذ آیت میں کیا ہے اور تقریر وتشریح جواب کی صورت کیا ہے اس لئے اس میں حضرات علماء [ص:۲۳۴] کی تقریریں مختلف ہیں جو اہل علم پر مخفی نہیں ہر چند یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مباحث ترجمہ کے احاطہ سے بہت اوپر ہیں اور ان کے لئے اور مواقع ہیں مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی وسیع ودقیق نظر چونکہ ان کو بھی حتی المقدور اور حسب گنجائش ترک کر دینا پسند نہیں کرتی تو سب طرف نظر ڈال کر آیت مذکورہ کا یہ ترجمہ فرمایا: "جو لوگ یقین لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر الخ" جس سے معلوم ہو گیا کہ آیت میں ایمان سے حقیقت ایمانی یعنی تصدیق قلبی مراد ہے معنی ثانی" تصدیق مع الاعمال" مراد نہیں جو باعث خلجان ہو سو اہل علم وفہم کو تو اتنا ہی اشارہ سب کچھ ہے مگر حضرت ممدوح نے ظلم کا ترجمہ لفظ تقصیر سے بیان فرما کر جس کی نظیر غالباً کسی اور موقع پر نہ ملے گی مطلب کو اور بھی واضح کر دیا اب اس میں غور کرنے سے بحمد اللہ دوسرا خلجان بھی صاف ہو گیا، دیکھئے دو لفظوں میں ایسی محقق بات فرما گئے کہ لمبی بحثوں کی حاجت نہ رہی

علیہم اجمعین کو پیش آیا تھا دوسرا اختلاف خلجان مذکور کے جواب میں مفسرین وغیرہ علمائے کرام کو پیش آ گیا کہ جواب کا مقصد اور اُس کا ماخذ کیا ہے سو خلجان معروضہ اصحاب کرام تو آپ کے ارشاد سے جاتا رہا مگر آپ کے ارشاد کے مقصد وماخذ میں علماء کو جو اختلاف پیش آ گیا وہ موجود ہے اس پر حضرات مترجمین نے تو ان لمبی لمبی بحثوں کو دیکھا کہ ترجمہ ان کو متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے مناسب اس لئے ترجمہ میں اس سے قطع نظر کر کر ظاہر کے موافق صحیح ترجمہ فرما دیا اور لمبی بحثوں کے لئے دوسرا موقع ہے اور حضرت شاہ صاحب کی دقیق نظر نے دیکھا کہ جب ہم کو ترجمہ میں کوئی زیادتی اور طول کرنا نہیں پڑتا صرف ایک لفظ کی جگہ دوسرا ویسا ہی لفظ بول دینے سے سب امور طے ہوئے جاتے ہیں تو پھر اس میں کیوں کوتاہی کی جاوے اور کام کی بات سے کیوں محروم رکھا جاوے تو انہوں نے اپنی عادت کے موافق یہ کیا کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ کے ترجمہ میں یہ الفاظ فرمائے "جو لوگ یقین

طرفہ یہ کہ یہ تحقیق دولفظی احق بالقبول معلوم ہوتی ہے جس سے حضرات صحابہ کے خلجان کا منشا اور ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ماخذ بھی سمجھ میں آتا ہے اور تقریر جواب میں جو بین العلماء خلاف ہے اس کی کیفیت بھی سمجھ میں آتی ہے اور آیت کے ترجمہ میں جو لفظ ''کچھ'' ظاہر فرمایا ہے جو اور تراجم میں نظر نہیں آتا وہ صاف بتلارہا ہے کہ حضرت ممدوح کو اقوال علماء پیش نظر ہیں اور اس میں جو بات راجح ہے اس کو بتلانا چاہتے ہیں۔

تمثیلات کے ذیل میں چونکہ استطر اداً یہ ذکر آگیا اس لئے بسط کا موقع نہیں البتہ اپنے موقع پر بسط نامناسب نہ ہوگا۔[ص:۲۴]

اس کے بعد **مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ** [سورۃ البقرۃ الآیۃ:۳] کے ترجمہ میں ''منْ'' تبعیضیہ کا ترجمہ لفظ ''کچھ'' سے ظاہر فرما کر ممانعت اسراف کی طرف اشارہ بتلا گئے جس سے اکثر تراجم خالی ہیں۔ جیسا کہ کتب تفسیر میں مصرح موجود ہے۔

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ [سورۃ البقرۃ الآیۃ:۹] کے ترجمہ میں فرماتے ہیں ''دغابازی کرتے ہیں اللہ سے'' جو سریع الفہم محاورہ کے موافق ترجمہ لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر'' جس سے معلوم ہوگیا کہ ایمان سے حقیقت ایمانی یعنی تصدیق قلبی مراد ہے حسب معروضہ سابق جس کو ایمان بالمعنی الاول کہتے ہیں۔ اہل فہم وانصاف کو تو بس یہی کافی ہے مگر اس پر اتنا اور کیا کہ ''ظلم'' کے ترجمہ میں لفظ ''تقصیر'' بیان فرمایا جس سے اور بھی وضاحت اور تکمیل ہوگئی اب اس میں غور کرنے سے نہ آیت میں کوئی خلجان ہوتا ہے نہ آپ کے ارشاد میں اختلاف باقی رہتا ہے دولفظوں میں ایسی تحقیق فرمادی کہ لمبی لمبی بحثوں کی ضرورت نہ رہی اور طرفہ یہ کہ یہ تحقیق دولفظی سب سے احق بالقبول معلوم ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلجان کا منشاء کیا تھا اور ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا منشاء کیا ہے۔ اور ترجمہ میں جو لفظ کچھ داخل فرمایا ہے جو اور ترجموں میں نہیں وہ یہ صاف بتلاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اقوال علماء کو پیش نظر رکھ کر جو بات محقق اور راجح ہے اس کو بیان فرمانا چاہتے ہیں۔

یہاں تمثیلات کے ذیل میں یہ ذکر استطر اداً

ہے۔ اور ظاہری اور مشہور ترجمہ میں جو خدشہ ہوسکتا ہے اور حضرات مفسرین کو اس کے جواب کی ضرورت پڑتی ہے اُس سے بھی بچاؤ ہوگیا جیسا کہ تفاسیر میں موجود ہے۔

عَذابٌ الِیْمٌ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۰] کا ترجمہ ''دکھ کی مار'' فرما کر بتلاگئے کہ **فَعِیلٌ** بمعنی مفعول ہے جو شائع اور راجح استعمال ہے اور محاورہ اردو بھی اس کے مطابق ہے۔

بِمَا کانوا یَکْذِبُونَ میں ''یکذبون'' کا ترجمہ جھوٹ کہتے تھے، فرمایا ''جھوٹ بولتے تھے'' نہیں فرمایا جو ظاہر اور محاورہ کے موافق زیادہ نظر آتا ہے۔ سو اس کی وجہ انشاء اللہ یہی ہے کہ جب کسی شخص کا علی العموم کاذب ہونا اور اس کا جھوٹ کا عادی ہونا بیان کرنا منظور ہوتا ہے تو کہتے ہیں۔ زید جھوٹ بولتا ہے اور جب اس کے کسی خاص مقولہ کی تکذیب مدنظر ہوتی ہے تو کہتے ہیں زید جھوٹ کہتا ہے اور یہی امر محاورہ کے زیادہ موافق ہے اور ظاہر ہے کہ اس موقع میں ان لوگوں کا علی العموم کاذب ہونا بتلانا منظور نہیں بلکہ **اٰمَنَّا بِاللّٰہ وبِالْیومِ الاٰخِرِ** [سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۸] جو کہا کرتے تھے جو اوپر آ گیا اس سے زائد بسط کا موقع نہیں اور حضرات اہل علم خود بھی جانتے ہیں البتہ سورۂ انعام میں اس آیت کے متعلق حاشیہ پر کچھ بسط سے عرض کردیا جاوے گا انشاءاللہ۔

اس کے بعد **مِمَّارَزَقْنٰھُمْ** کے ترجمہ میں ''من تبعیضیہ'' کا ترجمہ لفظ کچھ سے بیان فرما کر ممانعت اسراف کی طرف اشارہ کردیا جیسا کہ تفسیر بیضاوی وغیرہ میں مذکور ہے۔

یُخٰدِعُون اللّٰہ [سورۃ البقرۃ الآیۃ:۹] کے ترجمہ میں فرماتے ہیں ''دغابازی کرتے ہیں اللہ سے'' جو نہایت صاف اور مناسب ترجمہ ہے، اور کوئی خلجان اور وہم اس میں نہیں ہوسکتا۔ **عَذَابٌ اَلِیْمٌ** [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۰] کے ترجمہ میں ''دکھ کی مار'' فرما کر اشارہ کردیا کہ فعیل بمعنی مفعول ہے جو استعمال مفرد اور راجح ہے اور محاورہ کے موافق **بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُونَ** [سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۱۰] میں **یَکْذِبُونَ** کا ترجمہ ظاہر کے خلاف ''جھوٹ کہتے تھے'' فرماتے ہیں ''جھوٹ بولتے تھے'' نہیں فرمایا جو سہل او رظاہر کے موافق تھا، سو اس کی وجہ انشاءاللہ یہی ہے کہ جھوٹ بولتے تھے بظاہر اس سے

مذکور ہے، اس مقولہ خاص کی تکذیب فرمانی منظور ہے اور **عَذَابٌ اَلِیْمٌ** نفاق کی سزا ہے نہ کذب کی **فَلِلّٰہ دَرُّہ ما الطف طبعہ و[ص:۲۵]اسلم ذوقہ واحدَّ نظرہ.**

اور سنئے **مَایَشعرُونَ**[سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۹] اور **لایشعرون**[سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۲] جو ان آیات میں موجود ہے چونکہ **یشعرون** لفظ واحد ہے اس لئے اس کے ترجمہ میں بھی کسی نے فرق نہیں فرمایا مگر حضرت شاہ صاحب بال کی کھال نکال کر اول کا ترجمہ "نہیں بوجھتے" اور دوسرے کا ترجمہ "نہیں سمجھتے" فرماتے ہیں فرق کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ جہاں تأمل اور فکر کی حاجت ہوتی ہے اس کے سمجھنے کو "بوجھنا" کہتے ہیں تو اس فرمانے سے ادھر اشارہ ہوگیا کہ امر اول یعنی منافقوں کا اپنے نفسوں کو دغا دینا اس کے سمجھنے میں تامل کی حاجت ہے اور امر ثانی یعنی منافقوں کا مفسد ہونا ایسی کھلی بات ہے کہ ادنیٰ تامل کی حاجت نہیں۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس موقع میں **لایَشعرون** اور **لایعلمون**[سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۳] کا فرق ارشاد فرمایا ہے، شاہ

یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا کاذب ہونا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کیوجہ سے ان پر عذاب الیم ہوگا حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ لوگ **اٰمَنَّا بِاللّٰہ وبِالیَومِ الاٰخِرِ**[سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۸] جھوٹ کہا کرتے تھے یعنی منافق تھے اور **عذاب الیم** اس نفاق کے بدلے میں ہوگا۔ **فللّٰہ درہ ماالطف طبعہ واسلم ذوقہ واحدّنظرہ.** اور سنیے **مَایُشْعِرُونَ**[سورۃ البقرۃ الآیۃ:۹] اور **لاَیشعرون**[سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۲] جو ان آیات میں مذکور ہیں دونوں جگہ **یشعرون** ایک لفظ ہے کوئی فرق نہیں۔

اس لئے حضرات مترجمین دونوں کے ترجمہ میں کچھ فرق نہیں فرماتے مگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اول کا ترجمہ "نہیں بوجھتے" اور دوسرے کا نہیں سمجھتے فرماتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں تامل اور فکر کی حاجت ہوتی ہے اس کے سمجھنے کو "بوجھنا" کہتے ہیں حضرت ممدوح کے اس فرق فرمانے سے اِدھر اشارہ ہوگیا کہ امر اول یعنی منافقوں کا اپنے نفسوں کو دھوکا دینا اس

صاحب نے ایک لفظ یشعـــرون کو دو موقعوں پر بولنے سے بوجہ اختلاف محل جو باریک فرق نکلتا ہے اس کی طرف لطیف اشارہ فرمایا ہے جس سے فہم مطلب میں مدد ملتی ہے۔

ص:۲۶ اس کے بعد عرض ہے کہ ہم نے یہ چند نظائر چھوٹی بڑی جو شروع قرآن مجید کے کل صفحہ ڈیڑھ صفحہ کے متعلق ہیں، بلاقصد استیعاب موضح قرآن سے بطور نمونہ اور بغرض تنبیہ عرض کردیئے ہیں اس کو دیکھ کر ترجمہ موصوف کی خوبی واطافت اور اجمالی حالت معلوم ہوسکتی ہے اور ہماری معروضات سابقہ کی تصدیق بھی انشاء اللہ بقدر کفایت سمجھ میں آسکتی ہے باقی ترجمہ مذکور کا اول سے آخر تک ایک رنگ ہے چنانچہ اہل علم وفہم پر روشن ہے۔

باقی یہ ظاہر ہے کہ ترجمہ موصوف کے تمام فوائد چھوٹے بڑے کے بیان کرنے کی نہ

کے سمجھنے میں کچھ تأمل کی حاجت ہے اور امر ثانی یعنی منافقوں کا مفسد ہونا بالکل ایک امر ظاہر ہے ادنی تأمل کی بھی حاجت نہیں۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس موقع میں **لایشعرون** اور **لایعلمون** [سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۳] کا فرق بیان کیا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ کیا کہ ایک لفظ **یشعرون** کو دو موقعوں میں لانے سے بوجہ اختلاف محل جو باریک فرق نکلتا تھا اس کی طرف اشارہ فرما گئے۔

ص:۹ اس کے بعد عرض ہے کہ ہم نے یہ چند نظائر چھوٹی بڑی جو شروع قرآن مجید کے صفحہ ڈیڑھ صفحہ کے متعلق ہیں موضح القرآن سے بطور نمونہ اور تنبیہ عرض کردیئے ہیں اس کو دیکھ کر ترجمہ موصوف کی خوبی اور کیفیت بالاجمال معلوم ہوسکتی ہے اور ہمارے معروضات سابقہ کی تصدیق کے لئے انشاء اللہ کافی ہیں اور ترجمہ مذکورہ کا اول سے آخر تلک یہی رنگ ہے چنانچہ اہل علم پر واضح ہے مگر ہم اس امر سے معذور ہیں کہ جیسا ہم نے بطور نمونہ اس مقام کے متعلق چند نظائر عرض کی ہیں اسی طرح پر تمام ترجمہ کے نظائر

حاجت اور نہ گنجائش، البتہ جو بات قابل تنبیہ ہوگی اپنے موقع پر بالاجمال یا بالتفصیل فوائد کے ذیل میں انشاءاللہ عرض کردیں گے اور اہل فہم کو ایک دو جزو غور سے دیکھ لینے کے بعد اس قسم کے امور کے سمجھنے میں خود سہولت نظر آنے لگے گی۔

ص:۲۶–۲۷ خلاصہ یہ ہے کہ بروئے فہم وانصاف حضرت رحمہ اللہ نے حقیقت میں ایک مفید تفسیر تحریر [ص:۲۶] فرمائی ہے مگر ترجمہ کے لباس میں اگر اس کے الفاظ کو دیکھیں تو ایک سریع الفہم جچا تلا ترجمہ نظر آتا ہے اور معنی میں غور کیجئے تو ایک لطیف مفید تفسیر معلوم ہوتی ہے جس سے حضرت ممدوح کا بے نظیر کمال ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ اس کے برعکس بعض بلند خیال حضرات نے ترجمہ بہ لباس تفسیر لکھا ہے، جو حقیقت میں ترجمہ ہے نہ تفسیر پھر اس پر طرہ یہ کہ اس نام کے ترجمہ کو بڑھانے سے اور موضح قرآن کو گھٹانے سے باوجود کثرت موانع ایک چیز بھی مانع نہیں ہوئی مگر موشے بخواب آمد شتر شد، سچ ہے۔ شعر

گراز بسیط زمین عقل منعدم گردد
بخود گماں نبرد ہیچ کس کہ نہ دانم

اور فوائد کو بیان کریں اور نہ اس کی حاجت البتہ جو بات قابل تنبیہ ہوگی اس کو اپنے اپنے موقع پر بالاجمال یا بالتفصیل حاشیہ پر فوائد کے ذیل میں انشاءاللہ عرض کردیں گے اور اہل فہم کو ایک دو جزو غور سے سمجھ لینے کے بعد ان امور کے سمجھنے میں خود سہولت ہوجاوے گی۔

〃 یہ عبارت نقل میں نہیں ہے۔

ص:۲۷ احتیاطاً یہ بھی عرض کئے دیتے ہیں کہ موضح قرآن کے مختلف نسخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بعض مواقع میں محاورہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھ کر بعض نسخوں میں بالقصد تصحیف ہوئی ہے اور بعض جگہ کسی لفظ کو غیر مانوس دیکھ کر دوسرا لفظ جو مناسب سمجھا اس کی جگہ بدل دیا ہے مگر حضرت ممدوح کے لفظ کو بدلنا چونکہ نظر سرسری کا کام نہیں اس لئے ایسے الفاظ کی وجہ سے موضح قرآن میں یا ہمارے کسی تصرف میں کسی قسم کا خدشہ ٹھیک نہ ہوگا۔

// فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ حضرت حجۃ اللہ علی العالمین وللعالمین شاہ ولی اللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہ نے جب اول قرآن شریف کا ترجمہ "فتح الرحمٰن" بزبان فارسی تحریر [ص:۲۷] فرمایا تو ضروری ضروری فوائد بھی اس پر اضافہ فرمائے مگر بہت کم مواقع میں اور نہایت مختصر جس سے عام اہل اسلام نفع اٹھانے میں قاصر ہیں۔ اُس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے جب موضح قرآن اردو میں ترجمہ کیا تو حضرت ممدوح نے فوائد کو بھی ایک کافی مقدار تک بڑھایا جو نہایت کارآمد

// یہ عبارت نقل میں نہیں ہے۔

ص:۹ یہ امر بھی عرض کر دینے کے قابل ہے کہ حضرت حجۃ اللہ علی العالمین شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جب اول قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا تو حاشیہ پر ضروری فوائد بھی کچھ تحریر فرمائے مگر نہایت مختصر اور مجمل اور بہت کم موقعوں پر جو عام مسلمانوں کو کسی مرتبہ میں بھی کافی نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد جب حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا تو حضرت ممدوح نے فوائد کو بھی ایک مقدار کافی ضروری تک بڑھادیا۔ جو نہایت مفید اور کارآمد ہیں مگر مختصر عبارت اور

اور مفید ہیں مگر سادہ بول چال اور مختصر الفاظ میں
کہ بعض مواقع میں ہر کوئی بسہولت نہیں سمجھ
سکتا سو اس لئے اور نیز بوجہ اختلاف حاجت
ومذاق اہل زمانہ ان میں بھی زیادتی کماً وکیفاً
مناسب اور مفید معلوم ہوتی ہے۔

ص:۲۸　امور متعلقہ موضح قرآن کے عرض کرنے
کے بعد اب اپنی ناچیز ترمیم اور بے حقیقت
کوشش کی حقیقت کہ جس کے مناسب
درمناسب کسی کا یہ شعر دل سے بے تکلف
زبان پر آتا ہے:

مثال ہے میری کوشش کی یہ کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

گوش گذار ہے، اتنی بات تو پہلے معلوم ہو چکی
ہے کہ ترمیم صرف دو امر میں ہوگی لفظ متروک
کو بدل دینا اور حسب ضرورت اجمال وابہام کو
کھول دینا اسی کے متعلق اتنا اور عرض ہے کہ
ہم نے جس موقع میں کوئی تصرف کیا ہے تو یہ
نہیں کیا کہ اپنی رائے محض سے سرسری طور پر
جو مناسب دیکھا بدل دیا، یا بڑھا دیا نہیں بلکہ
حضرات اکابر کے تراجم میں سے حتی الوسع
لینے کی کوشش کی ہے خود موضح قرآن میں
دوسرے موقع پر کوئی لفظ مل گیا یا حضرت

سادہ الفاظ میں کہ بعض مواقع میں ہر کوئی
سہولت سے نہیں سمجھ سکتا۔

〃　اب اصل ترجمہ کی کیفیت بیان کرنے کے
بعد اپنی ترمیم کے متعلق عرض ہے کہ یہ تو
پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ترمیم صرف دو امر
کے متعلق ہے۔ لفظ متروک کو بدل دینا
اور کہیں کہیں حسب ضرورت اجمال کو کھول
دینا اس کے بعد اتنا اور عرض ہے کہ جس
موقع پر ہم کو لفظ بدلنے کی نوبت آئی ہے
وہاں ہم نے یہ نہیں کیا کہ اپنی طرف سے جو
[ص:۱۰] مناسب سمجھا بڑھا دیا نہیں بلکہ
حضرات اکابر کے تراجم میں سے لینے کی
کوشش کی ہے خود موضح القرآن میں دوسری
جگہ کوئی لفظ مل گیا یا حضرت شاہ عبدالقادر
صاحب کی اردو کی تفسیر میں یا حضرت مولانا
رفیع الدین کے ترجمہ میں یا ''فتح الرحمٰن''
میں حتی الوسع ان میں سے لینے کو پسند
کیا ہے۔ البتہ کچھ مواقع ایسے بھی نکلیں
گے جہاں کسی وجہ سے ہم نے اپنے خیال

ممدوح کی اردو کی تفسیر میں یا حضرت مولانا شاہ
رفیع الدین کے ترجمہ میں یا فتح الرحمٰن میں ان
میں سے لینے کو پسند کیا ہے، البتہ کچھ مواقع
ایسے بھی ہیں کہ جہاں ہم نے کوئی لفظ اپنی
طرف سے کسی ضرورت سے داخل کر دیا ہے
مگر جہاں ہم نے ایسا کیا ہے تو وہاں لفظ و معنی
دونوں کا خیال رکھا ہے۔

ص:۲۹-۳۴ یعنی [ص:۲۸] لفظ سلیس اور محاورہ
کے موافق ہو اور مطابق غرض اور مناسب
مقام بھی ہو اور اگر کہیں ایسا لفظ ہم کو ہاتھ نہیں
آیا تو وہاں رعایت معنی کو ترجیح دی ہے یعنی
ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو موافق مراد اور
مناسب مقام پورا ہو گو اس میں کچھ طول ہو یا
ٹھیٹ محاورہ نہ ہو۔

اور جہاں ہم نے کسی وجہ سے اصلی ترجمہ کی
ترتیب کو کچھ بدلا ہے یا اور کوئی تغیر کیا ہے
تو یہ ضرور خیال رکھا ہے کہ اس کی نظیر
حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے تراجم میں
موجود ہو ایسا تغیر جس کی نظیر تراجم موصوفہ
میں نہ ہو ہم نے جائز نہیں رکھا اتفاق سے
اگر کوئی موقعہ ہماری اس غرض کے مخالف
نظر آوے تو وہ یقیناً ہمارا سہو ہے یا خطا۔

کے موافق کوئی لفظ داخل کر دیا ہے اور جہاں
ہم نے کوئی لفظ بدلا ہے وہاں دونوں باتوں
کا خیال رکھا۔

ص:۱۰ یعنی لفظ ہلکا سہل محاورہ کے موافق بھی
اور مطابق غرض اور موافق مقام بھی پورا ہو
اور جس جگہ ایسا لفظ ہم کو نہیں ملا وہاں جانب
معنی کو ترجیح دی ہے۔ یعنی لفظ موافق مراد اور
مناسب مقام کو اختیار کیا ہے گو اس میں کسی
قدر طول ہو یا لفظ بہت مشہور نہ ہو۔

اور ہم نے جس جگہ کسی مصلحت سے ترتیب
کو بدلا ہے یا اور کوئی تغیر کیا ہے تو یہ ضرور لحاظ
رکھا ہے کہ اس کی نظیر حضرات اکابر کے تراجم
میں موجود ہونی چاہئے ایسا تغیر جس کی نظیر
مقدس حضرات کے تراجم میں نہ ہو ہم
نے کل ترجمہ میں جائز نہیں رکھا۔ اتفاق
سے اگر کوئی موقع اس غرض کے خلاف ہو تو
وہ یقیناً ہمارا سہو ہے یا خطا۔ بالقصد جان
بوجھ کر ہم نے ایسا کہیں نہیں کیا۔

بالقصد جان بوجھ کر ہم نے ایسا نہیں کیا۔
یہ بات بھی عرض کر دینے کے قابل ہے کہ موضح قرآن کی عبارت میں جو ہم نے چھوٹے چھوٹے تصرفات کئے ہیں وہ جگہ جگہ نظر آویں گے مگر نہایت صغیر اور حقیر برائے نام اور جس مصلحت کے لئے ترمیم کی گئی ہے انشاءاللہ اس کے موافق ہوں گے۔
خلاصہ یہ ہے کہ تغیرات موضح قرآن کی نسبت جو ہم اوپر عرض کر آئے ہیں وہی حال بعینہٖ ہمارے تصرفات کا سمجھنا چاہئے، علاوہ ازیں ہماری تمام سعی کا مقصود تو یہی تغیر ہے پھر اس کارخدمت میں کون متأمل ہوسکتا ہے ہم جس قدر تغیر کریں گے اپنی خدمت واجبہ بجالائیں گے، البتہ قابل لحاظ یہ ہے کہ موضح کی عبارت میں تغیر وتبدل یا زیادتی کیوں کی اور کیسی کی اور کتنی کی۔
بعض کلمات قرآنی کے ترجمہ اور مراد میں علماء کرام کی رائے مختلف ہے اور بعض آیات کے مطلب میں باہم گفتگو ہے سو ایسے موقع میں ہم نے علی العموم موضح قرآن کا اتباع کیا ہے اتنی بات پر موضح قرآن کے حضرات علماء میں بعض کلمات قرآنی کے ترجمہ میں باہم کچھ خلاف ہوا ہے اور بعض آیات کے مطلب میں بھی کچھ نزاع ہے سو ایسے مواقع میں ہم نے حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ ہی کا اتباع کیا ہے الا ماشاءاللہ کہ کسی موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی متابعت اختیار کی ہے۔
فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ موضح القرآن کے جملہ فوائد کے لینے کا التزام کیا گیا ہے۔ مگر شاذونادر کہ کسی وجہ سے اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی اور فوائد میں چونکہ ہر طرح سے گنجائش اور وسعت ہے ترجمہ کی طرح قید اور تنگی نہیں تو اس لئے ہم نے اکثر یہ کیا ہے کہ حضرت ممدوح کے فوائد کو اپنی عبارت میں بیان کیا ہے اور تقدیم وتاخیر تغیر وتبدل اجمال وتفصیل وغیرہ امور سے احتراز نہیں کیا اور بہت سے فوائد بالاستقلال مفید اور نافع سمجھ کر مختلف موقعوں سے لے کر اپنی رائے سے بڑھا دیے ہیں۔
اور حضرت شاہ صاحب کی تقلید کی وجہ سے ترجمہ میں اگر کسی جگہ قدرے تنگی رہ گئی تو اس کے بدلے میں مکافات سے بھی زائد فوائد میں اس کو واضح کر دیا گیا ہے۔

ترجمہ کو بدلنا پسند نہیں کیا مگر شاذ ونادر کہ وہاں کسی خاص ضرورت اور مصلحت سے [ص:۲۹] شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی متابعت اختیار کی ہے۔

فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ موضح قرآن کے جملہ فوائد کو لینے کا التزام کیا ہے الاماشاءاللہ کہ کسی وجہ سے کسی فائدہ کے بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی اور فوائد میں چونکہ ہر طرح سے گنجائش اور وسعت ہے ترجمہ کی طرح قید اور تنگی نہیں تو اس لئے ہم نے اکثر یہ کیا ہے کہ حضرت ممدوح کے فوائد کو اپنی عبارت میں بیاں کیا ہے اور تقدیم وتاخیر اجمال وتفصیل وغیرہ کی پرواہ نہیں کی اور بہت سے فوائد بالاستقلال جو مفید نظر آئے مختلف معتبر موقعوں سے لے کر بڑھا دئے اور حضرت ممدوح رحمہ اللہ کی تقلید کے باعث اگر ترجمہ میں کہیں قدرے تنگی رہ گئی تو اس کے بدلے میں مکافات سے بھی زائد فوائد میں اس کی توضیح کردی ہے۔

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارا مبلغ سعی صرف ترجمہ موصوف کی خدمت گذاری ہے جو سب کو اور بغرض تشریح وتسہیل وتکمیل فوائد کی تکثیر کو ہم نے اختیار کیا۔ فوائد میں طول ہوجانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو کوئی مترجم فوائد لکھتا ہے وہ صرف کلام مجید کے متعلق لکھتا ہے اور احقر کو اس کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کے متعلق بھی بعض مواقع میں کچھ کچھ عرض کرنے کی نوبت آتی ہے کیونکہ ہماری تمام سعی کا لب لباب دراصل ترجمہ موصوف کی خدمت گذاری ہے وبس۔

چونکہ بعض بعض مقامات پر کچھ کچھ ترمیم کرنے سے حقیقت میں یہ دوسرا ترجمہ نہیں ہوگیا اس لئے اس کا کوئی نام مستقل مقرر کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا مگر صرف دفع التباس اور رفع اشتباہ کی مصلحت سے مناسب معلوم ہوا کہ اگر اصل ترجمہ کے نام کے علاوہ اس کا بھی کچھ نام رکھ دیا جاوے تو التباس واشتباہ سے پورا بچاؤ رہے گا، اس کا نام موضح قرآن ہے اس کا نام موضح فرقان بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک کے ہیں ایک اور ہیں دو کے دو۔ کہنے کو دو اور حقیقت میں ہیں ایک۔ مگر موضح قرآن میں یہ خوبی ہے کہ تاریخی بھی ہے۔ موضح فرقان

معلوم ہے اور یہ بات بھی روشن ہے کہ اتنی
بات سے کہ ترجمہ موصوف میں ہم نے کچھ
الفاظ وہ بھی اکثر ادھر ادھر سے لے کر شامل
کردئے اس ترجمہ کو ہماری طرف منسوب
کرنا اس سے زیادہ نہیں کہ دوشالہ میں کمبل
سے رفو کر کے اس کو کمبل کہنے لگیں بہت
سے بہت وہ دو چار مٹھی الفاظ ہماری طرف
منسوب ہوسکیں وبس۔ سواس لئے ترمیم
کے بعد اس ترجمہ کا مستقل دوسرا نام تجویز
کرنا ہرگز مناسب نظر نہیں آتا کیونکہ
کہیں کچھ الفاظ شامل کرنے سے یہ مستقل
دوسرا نہیں ہوگیا لیکن صرف رفع اشتباہ
اور دفع التباس کی ضرورت سے خیال
ہوتا ہے کہ اصل ترجمہ کے نام کے سوا اس
کا بھی کوئی نام مخصوص ہو تو اختلاط
والتباس سے پورا بچاؤ رہے گا، سو موضح
قرآن کی مناسبت سے اس کا [ص:۳۰]
نام موضح فرقان مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر
موضح قرآن میں یہ خوبی زائد ہے کہ تاریخی
بھی ہے موضح فرقان تاریخی نہیں ہاں گھٹا
بڑھا کر کچھ تکلف کے بعد تاریخی
ہوسکتا ہے۔قطعہ

تاریخی نہیں ہاں گھٹا بڑھا کر کچھ تکلف کے
بعد تاریخی بھی ہوسکتا ہے۔قطعہ

یادگار شہ عبدالقادر
ترجمہ موضح قرآن مجید
وہ کہ آن معدن صد خوبی را
کرد ترمیم اقل العبید
بے شش وپنج بگفتہ محمود
سال او موضح فرقان حمید

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ سب مسلمانوں پر
فرض ہے کہ اپنے رب کو پہچانیں اور اس کی
صفات اور اسکے احکام کو معلوم کریں اور تحقیق
کریں کہ حق تعالیٰ کونسی باتوں سے خوش ہوتا
ہے اور کون سی باتوں سے غصہ ہوتا ہے
اور اس کی خوشی کے کاموں کو کرنا اور اس کی
ناخوشی کے کاموں سے بچنا اسی کا نام بندگی
ہے اور جو بندگی نہ کرے وہ بندہ نہیں
اور سب کو معلوم ہے کہ آدمی جب پیدا ہوتا
ہے سب چیزوں سے ناواقف اور محض
انجان ہوتا ہے پھر سکھلانے سے سب کچھ
سیکھ لیتا ہے اور بتلانے سے ہر چیز جان
لیتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کا پہچاننا اور اس
کی صفات اور احکام کا جاننا بھی بتلانے
اور سکھلانے سے آتا ہے۔لیکن جیسا کہ حق

یادگار　شہ　عبدالقادر
ترجمہ　موضح　قرآن　مجید
وہ کہ آن مجمع صدخوبی را
کردہ ترمیم اقل العبید ؎
بے شش وپنج بگفتہ محمود
سال او موضح فرقاں حمید

واجب الاظہار

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے رب کو پہچانیں اوراس کی صفات اور اس کے احکام کو معلوم کریں او رتلاش کریں کہ حق تعالیٰ کونسی بات سے خوش ہوتاہے اورکونسی بات پر غصہ ہوتاہے اوراس کی خوشی کے کاموں کو کرنا اورناخوشی کے کاموں سے بچنا اسی کانام بندگی ہے اور جو بندگی نہ کرے وہ بندہ نہیں۔

سب جانتے ہیں کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے سب چیزوں سے ناواقف اور انجان ہوتاہے پھر سکھلانے سے سب کچھ سیکھ لیتا ہےاور بتلانے سے ہر چیز جان لیتا ہےاسی طرح حق تعالیٰ کا پہچاننا اوراس کی صفات اوراحکام کا جاننا بھی سکھلانے اور بتلانے سے آتا ہےلیکن ان باتوں کوجیساحق تعالیٰ تعالیٰ نے ان باتوں کوقرآن شریف میں خود بتلایا ہے ویسا کوئی نہیں بتلاسکتا اورجو اثر اور برکت اور ہدایت خدائے تعالیٰ کے کلام پاک میں ہے وہ کسی کے کلام میں نہیں۔

اس لئے عام خاص جملہ اہل اسلام کو لازم ہے کہ اپنے اپنے درجے کے موافق کلام اللہ کے سمجھنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں سو قرآن شریف کےاوپر کےدرجہ کے مطالب اورخوبیاں توعالموں کے سمجھنے کی بات ہے مگر جولوگ کہ علم عربی سے ناواقف ہیں ان کوبھی کم سے کم اتنا ضرور کرنا چاہئے کہ علمائے دین نے جوسلیس ترجمے ان کی زبان میں عوام کی واقفیت اور ہدایت کے لئے کردیے ہیں ان کے ذریعہ سے اپنے معبود حقیقی کے کلام کے سمجھنے میں ہرگز کاہلی نہ کریں اوراس نعمت لازوال سے بالکل محروم نہ رہیں کہ بہت بڑی بدبختی اور کم قسمتی ہے مگر اس میں اتنااندیشہ ضرور ہے کہ صرف فارسی خواں یا اردوداں جومحاورات عرب سے ناواقف ہے محض سلیس ترجمہ کو دیکھ کر کچھ کا کچھ سمجھ جاوے گا کیونکہ پچھلی بات کا پہلی بات سے ملنا یا جدا ہوجانا اکثر مواقع میں بدون بتلائے ناواقف کی سمجھ میں نہیں آتا اورکسی

؎ حاشیہ پرنسخہ کی علامت دے کرلکھاہے: اذل العبید

نے اپنے کلام میں خود بتلایا ہے ایسا کوئی نہیں بتلاسکتا اور جو اثر اور برکت اور ہدایت حق تعالیٰ کے کلام پاک میں ہے وہ کسی کے کلام میں نہیں۔ [ص:۱۳۱] اس لئے عام وخاص اہل اسلام پر لازم ہے کہ اپنے اپنے درجہ اور لیاقت کے موافق کلام اللہ کے پڑھنے اور سمجھنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں قرآن شریف کے اوپر کے درجہ کے مطالب اور خوبیاں تو عالموں کے سمجھنے کی باتیں ہیں مگر جو لوگ علم عربی سے ناواقف ہیں ان کو بھی کم سے کم اتنا ضرور ہے کہ علماء دین نے جو صحیح اور سلیس ترجمے ان کی زبان میں کردیئے ہیں ان کے ذریعہ سے اپنے معبود کے مقدس کلام کے سمجھنے میں غفلت اور کم ہمتی نہ کریں اور اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہ رہیں کہ بڑی بدبختی اور خسارہ کی بات ہے۔ مگر اس میں یہ اندیشہ ضرور ہے کہ صرف فارسی خواں یا اردوداں جو کلام عرب سے ناواقف ہے اردو ترجمہ کو دیکھ کر کچھ کا کچھ سمجھ جاوے کیونکہ پچھلی بات کا پہلی بات سے ملنا یا جدا ہونا اکثر مواقع میں بدون بتلائے ناواقف کی سمجھ میں نہیں آتا ایسے ہی کسی مضمون مجمل اور مبہم میں غلطی ہوجانی مضمون مجمل اور مبہم میں کچھ کا کچھ سمجھ جانا عوام سے کچھ بعید نہیں یہاں تلک کہ بعض آیتوں میں ضمیر کے مرجع میں غلطی کھا کر خرابی میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ نیز یہ امر بھی ضروری ہے کہ کلام الٰہی کے معنی بلا سند معتبر نہیں اور سلف صالحین کے مخالف کسی آیت کے معنی لینے جہل اور گمراہی ہے، بالخصوص موضح القرآن کے ان فوائد کو سمجھنا جو کہ جگہ جگہ حضرت شاہ صاحب نے اشارۃً ارشاد فرمائے ہیں بدون بتلائے عالم واقف کے ممکن نہیں جیسا کہ ابھی معروض کرآیا ہوں۔ سوان وجوہ سے لازم ہے کہ استاد سے سیکھنے میں مسلمان کاہلی اور کوتاہی نہ کریں اور محض اپنی رائے پر اعتماد کرکے ثواب کے بدلے اللہ کا غصہ نہ کماویں۔ **واللہ الموفق وھو یھدی السبیل.**

یہ مضمون حضرت شاہ صاحب کا ہے جو تھوڑی سی تفصیل اور تغیر کے ساتھ ہم نے مفید سمجھ کر عرض کردیا ہے۔ اگر کاش مسلمانان ہند اس مفید قابل اہتمام مضمون کی پابندی کرتے تو آج ترجمہ موضح القرآن کے سمجھ میں نہ آنے کی شکایت نہ کرتے۔

اور جو حضرات ترجمۂ موصوف کے سمجھنے میں

ناواقف سے بعید نہیں حتی کہ بعض جگہ ضمیر کے مرجع میں غلطی کھا کر خرابی میں پڑنے کا ڈر ہے اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ کلام اللہ کے معنی بدون سند معتبر نہیں سلف صالحین حضرات صحابہ وتابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مخالف کلام اللہ کے معنی لینے سراسر جہل اور گمراہی ہے، اللہ سب کو اس سے بچائے، سو ان وجوہ سے لازم ہے کہ استاد سے سیکھنے میں کاہلی نہ کریں اور محض اپنی رائے سے کچھ کا کچھ سمجھ کر ثواب کے بدلے اللہ کا غصہ نہ کماویں، واللّٰہ ولی التوفیق وھو یھدی السبیل.

یہ مضمون حضرت شاہ صاحب کا ہے جس کو کچھ تغیر اور تفصیل کے ساتھ ہم نے عرض کر دیا ہے۔ کاش اہل اسلام ہند اس مفید مہتم بالشان ارشاد کا اتباع کرتے تو آج ترجمہ موضح قرآن میں دقت اور دشواری کی شکایت نہ فرماتے۔[ص:۳۲]

تا کے ملامت مژۂ اشکبار من
یکبار ہم نصیحت چشم کبود خویش

بلکہ جو حضرات ترجمہ موصوف کے سمجھنے میں آج سست نظر آتے ہیں وہ دوسروں کے آج سست اور کاہل نظر آتے ہیں وہ دوسروں کے سمجھانے میں چست اور مستعد نظر آتے۔ حضرات علماء عام اہل اسلام کی بہبودی اور نفع رسانی کی غرض سے سہل سے سہل نئے نئے ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں۔ مگر انصاف سے اس وقت تلک نفع مذکور باوجود کثرت تراجم عام اور شائع طور پر اہل اسلام میں نہیں پھیلا۔ جب تلک خود اہل اسلام ترجمۂ قرآن شریف کو ضروری اور مفید سمجھ کر اپنے شوق اور توجہ سے سیکھنا اور سمجھنا نہ چاہیں گے اس وقت تک صرف تکثیر تراجم سے عوام کو کیا نفع پہنچ سکتا ہے۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

قطعہ

فہم سخن تا نکند مستمع
قوت طبع از متکلم مجوئے
فسحت میدان ارادت بیار
تا بزند مرد سخن گوئے گوئے

حضرات علماء نے عوام کی بہبودی کی غرض سے جیسے سہل اور آسان متعدد ترجمے شائع فرما دیئے ہیں ایسے ہی اس کی بھی حاجت ہے کہ علی العموم مسلمانوں کو ان ترجموں کے

سمجھانے میں چست دکھلائی دیتے۔
حضرات علماء کے نئے نئے ترجمے عام اہل اسلام کی نفع رسانی کی غرض سے شائع ہوتے رہتے ہیں مگر بروئے انصاف باوجود کثرت تراجم عام طور پر ان کا نفع محسوس نہیں ہوتا جب تک خود اہل اسلام ضروری اور مفید سمجھ کر اپنے شوق سے ترجمہ قرآن مجید کو سیکھنا اور سمجھنا نہ چاہیں گے اس وقت تک صرف کثرت تراجم سے کیا نفع ہوسکتا ہے بقول شیخ علیہ الرحمۃ:

قطعہ

فہم سخن تا نکند مستمع
قوت طبع از متکلم مجوئے
فسحت میدان ارادت بیار
تا بزند مرد سخن گوئے گوئے

اور شوقیہ اور اتفاقیہ دیکھ لینے سے مقصود حاصل نہیں ہوتا، اسی ضرورت کی وجہ سے اہل علم اور خادمان اسلام کی خدمت میں بھی عرض ہے کہ عام اور خاص دونوں طریقہ سے اہل اسلام کو ترجمہ قرآن اور فہم کلام الٰہی کی طرف متوجہ فرمانے کی نہایت ضرورت ہے بلکہ اس کی بھی حاجت ہے کہ خاص ایسے سلسلے مختصر قائم ہوں کہ ہر کوئی اپنی سیکھنے اور ان کے سمجھنے کی طرف رغبت بھی دلائی جاوے علماء کرام اہل اسلام کو خاص طور سے ترجموں کے سمجھنے اور پڑھنے کی ضرورت اور اس کی منفعت دل نشیں کرنے میں کوتاہی نہ فرماویں بلکہ ترجمہ کی تعلیم کے لئے ایسے سلسلے بھی قائم فرمادیویں کہ جو چاہے بسہولت اپنی حالت کے مناسب اور فرصت کے موافق حاصل کر سکے۔ واللّٰہ الموفق والمعین.

حالت اور فرصت کے موافق اپنی ضرورت سہولت سے پوری کر سکے اور معانی کلام الٰہی سے واقف ہو سکے اور اسی طریقہ سے جملہ احکام الٰہی کانوں تک تو پہنچ جائیں۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ارشاد کی بھی تعمیل ہوجاوے۔ **واللّٰہ الموفق والمعین وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربِّ العالمین.** [ص:۳۳]

التماس اخیر: جملہ معروضات سے فراغت کے بعد عرض ہے کہ ترجمہ موضح قرآن کے احسن التراجم ہونے میں تو انشاء اللہ اہل فہم کی طرف سے کسی تأمل وتردد کا اندیشہ نہیں البتہ اس امر کا فکر ضرور ہے کہ اپنے حوصلہ کے موافق بغرض نفع واصلاح جو اس کی خدمت گذاری کی ہے خدا کرے وہ نادان دوست کی خدمت گذاری نہ ہو، سو اس لئے اہل علم وانصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر ہماری خامہ فرسائی کا نتیجہ شائع ہوکر کسی وقت آپ حضرات تلک پہنچے تو ملاحظہ فرما کر جو امور قابل اصلاح سمجھی جاویں ان سے بے تکلف مطلع فرمانے میں دریغ نہ ہو۔

اِلتماس اَخیر: حضرت شاہ صاحب کے اصل ترجمہ کا احسن التراجم اور انفع التراجم ہونا تو انشاء اللہ ایسا نہیں کہ اہل علم ودیانت میں کوئی اس کا منکر ہو ہاں احقر نے [ص:۱۱] جو اس کی خدمت اور ترمیم کی ہے اس کی نسبت ضرور ہم کو خلجان ہے اس لئے اہل علم وانصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر یہ ترجمہ شائع ہوکر کسی وقت آپ حضرات تک پہنچے تو اس کی حاجت ہے کہ ایک نظر اس کو ملاحظہ فرما کر جو امور قابل اصلاح معلوم ہوں ان سے ہم کو مطلع فرمانے میں تامل نہ فرماویں اور اگر کوئی صاحب بالاستقلال ترمیم فرمانا زیادہ پسند کریں تو وہ بالاستقلال اس خدمت کو انجام دینے میں سعی فرماویں، ہماری غرض صرف

اور اگر کوئی صاحب ہماری ترمیم کی اصلاح فرمانے سے اس خدمت کو بالاستقلال انجام دینا زیادہ مفید سمجھیں تو وہ بالاستقلال اس خدمت کو انجام دیں ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ یہ بے نظیر ترجمہ جو اہل علم اور عوام دونوں کو مفید تر ہے ایک سرسری عذر کی وجہ سے تقویم پارینہ نہ کر دیا جاوے اور جو کوئی اور جس طرح اس کی تلافی اور تدارک بہتر سے بہتر کر سکے وہ اس میں کوتاہی نہ کرے، مصرعہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

تــــــــمــــــــت

یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید تر جمہ جو اہل علم اور عوام دونوں کو مفید ہے ایک تھوڑے سے بہانہ سے نظروں سے نہ گر جاوے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ رہ جاویں اور ایک صدقہ جاریہ میں خلل اور نقصان نہ آ جاوے جس طرح ہو اور جو کوئی اس کی تلافی اور تدارک بہتر سے بہتر کر سکے وہ اس میں کوتاہی نہ کرے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

نواب سلطان جہاں بیگم، والیہ بھوپال
اور
حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی
عقیدت وارادت، بیعت کا رشتہ اور طرفین کے خطوط

نور الحسن راشد کاندھلوی

محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد [بن ہدایت احمد[۱]] گنگوہی [ولادت:۶/ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ ۱۱/مئی ۱۸۲۹ء وفات:۸/جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ ۔۱۱/اگست ۱۹۰۵ء یوم جمعہ] کا اپنے دور کے ممتاز ترین، نادرۂ روزگار، بلکہ اس علاقہ کے علماء اور کاملین زمانہ کی صف اول کے اکابر بلکہ ان کے رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے، حضرت مولانا کے اس مقام اور عالی مرتبہ کا، اس وقت بھی تمام طبقات اہل کمال کی جانب سے

---

(۱) مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش گنگوہی، تقریباً ۱۲۱۶ھ [۱۸۰۲ء] میں پیدا ہوئے۔ علمائے دہلی سے تکمیل علوم کی، حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی [ولادت: ۱۱۵۸ھ۔ وفات:۲۲/صفر ۱۲۴۰ھ ۔۱۶/اکتوبر ۱۸۲۴ء] سے بیعت ہوئے، خلافت واجازت سے نوازے گئے۔ کلکتہ میں ایک ملازمت پر تھے، لمبی رخصت لے کر آئے تھے، وطن میں ٹھہر کر کلکتہ واپس جارہے تھے، گورکھپور پہنچ کر بیمار ہوئے، وہیں جمادی؟ [تذکرۃ الرشید میں اسی طرح ناقص درج ہے، ص:۱۷، ج:۱] ۱۲۵۲ھ [ستمبر، اکتوبر ۱۸۳۸ء] میں وفات ہوگئی، وفات کے وقت ساڑھے پینتیس سال عمر تھی۔

مولانا ہدایت احمد کی نسبت معلومات کم دستیاب ہیں، اگرچہ ہوالغنی تکملہ مقامات مظہری، تالیف: حضرت شاہ عبدالغنی مجددی [مطبع احمدی دہلی] میں شاہ غلام کے خلفاء کی لمبی فہرست میں، مولانا ہدایت احمد کا نام شامل نہیں، مگر مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید [ص:۱۷] میں اور خود مولانا ہدایت احمد صاحب نے، اپنی تالیف ہدایت احمدی میں صراحت کی ہے، کہ مجھے شاہ غلام علی سے اجازت وخلافت ہے۔

ہدایت احمدی کا، حضرت مولانا گنگوہی پر لکھنے والوں نے تذکرہ نہیں کیا۔ یہ کتاب ۱۲۴۶ھ [۳۱-۱۸۳۰ء] میں مرتب ہوئی تھی، فقہ حنفی میں شرح وقایہ کا عمدہ ضروری خلاصہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ میرے علم میں ہے، مفصل تعارف آئندہ کسی شمارہ میں آئے گا اور اصل کتاب بھی ان شاء اللہ چھپے گی۔

بھرپور اعتراف و اعلان ہوا اور اس کے بعد سے عصر حاضر تک، ہر دور میں اس کا بلند آہنگی سے تذکرہ ہوتا رہا۔

حضرت مولانا کے سامنے اپنے مقام و مرتبہ کو فراموش کرنے، بلکہ ہیچ جاننے سمجھنے والوں میں علماء، مشائخ، اہل فقہ و افتاء اور اصحاب درس و تعلیم کے علاوہ، ارباب دولت و اقتدار، اہل حکومت و منصب بھی شامل تھے۔ علماء، صلحاء، طالبان راہ خدا اور طالبان سلوک و معرفت کی طرح، یہ بھی حضرت مولانا کے دامن تربیت سے وابستگی کو اعزاز و سعادت سمجھتے تھے اور حضرت مولانا کے یہاں حاضری اور کلمات خیر کو، سرمایۂ دارین شمار کرتے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے جو چند نام بہت ممتاز اور نمایاں ہیں، ان میں افغانستان کے حکمراں، جنرل محمد نادر، ان کے والد اور دادا کے علاوہ،[1] اس عہد کی برصغیر ہند کی ممتاز ترین حاکم اور نہایت نیک نام خاتون، والیۂ بھوپال، بیگم سلطان جہاں صاحبہ بھی شامل تھیں۔ بیگم سلطان جہاں کی حضرت مولانا گنگوہی سے واقفیت اور ارادت قدیم تھی، جو آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور حضرت مولانا کے بیعت ہونے کے ارادہ تک پہنچ گئی تھی۔

حضرت مولانا کے زندگی کے آخری دنوں میں، بیگم صاحبہ نے، حضرت مولانا سے، اپنے خاص نمائندوں کے ذریعہ سے رابطہ کیا، حضرت مولانا کی خدمت میں بیعت قبول کئے جانے کی درخواست کے خطوط بھیجے اور حضرت کی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت مولانا نے محترمہ کے اصرار پر، اپنی شرائط کی منظوری کے بعد، بھوپال کے ایک ممتاز عالم اور اپنے ایک پرانے متوسل کے سفارشی بن کر آنے پر، درخواست بیعت قبول فرمائی اور محترمہ بیگم سلطان صاحبہ کو اپنے وابستگان اصلاح و تربیت شامل فرمالیا۔

یہ واقعہ برصغیر ہند کی دینی علمی روحانی اور سیاسی دنیا کا، ایک اہم یادگار واقعہ تھا، اس کا کثرت سے تذکرہ چرچا ہونا چاہئے تھا، مگر کم لوگ ہیں، جن کو اس کا علم ہے اور اگرچہ نواب سلطان جہاں کو، ان کے کمالات اور مرتبہ علمی اور دینی علمی اداروں اور اہل کمال کے ساتھ سخاوت و عنایات کی وجہ سے اکثر یاد کیا جاتا ہے اور نہ جانے کب تک یاد کیا جائے گا، مگر ان کے کمالات و مرتبہ کا تذکرہ کرنے والے، اس کو نظر انداز

(۱) حضرت مولانا کے فرزند، مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی کے نام جنرل نادر کا خودنوشت خط، جس سے جنرل نادر کے والد اور دادا کے حضرت مولانا گنگوہی سے مراسم اصلاح و تربیت کی تصدیق ہوتی ہے، آئندہ کسی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

کر دیتے ہیں کہ بیگم صاحبہ، اس جاہ ومرتبہ اور سطوت وحکومت کے ساتھ، دل بیدار اور قلب دردمند بھی رکھتی تھیں اور اس شان وشوکت کے باوجود، اہل دل کے حضور اپنی قلبی کیفیات پیش کرنے اور ان کے بتائے ہوئے معمولات اور طریقہ کو، راہ عمل بنانے کی آرزو رکھتی تھیں، یہی بیگم صاحبہ کی سیرت وسوانح کا وہ پہلو ہے، جس نے ان کے قلب میں گداز، عمل میں اخلاص اور اعمال وخدمات میں برکت اور دیرپا اثرات پیدا کئے۔

بیگم صاحب کی حضرت مولانا گنگوہی سے ارادت وبیعت کا، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں ذکر کیا ہے[۱] اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی [تکمیل نزہۃ الخواطر میں] اس کا مختصر اشارہ کیا ہے، تحریر ہے کہ:

"وبایع الامام رشید احمد الگنگوھی"[۲]

مگر اس اجمال کی تفصیلات اور بیگم صاحبہ کی، حضرت مولانا سے مراسلت ومکاتبت کے بعض اجزاء اور خطوط نامعلوم تھے، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے جو تذکرہ کیا ہے، وہ ناقص ونا تمام ہے۔ مولانا میرٹھی کی تحریر میں اس سلسلہ مراسلت کے صرف دو خط شامل ہیں، ایک خط کا ضمنی اشارہ ہے دو اور کا تذکرہ بھی نہیں۔ جن خطوط کا مولانا میرٹھی نے ذکر کیا ہے، ان کی تاریخ تحریر وکتابت میں بھی غلطی ہوگئی ہے، آئندہ صفحات میں، بیگم صاحبہ بھوپال اور حضرت مولانا گنگوہی کی اس مراسلت کی صحیح روداد اور تازہ دریافت دو خطوط جو راقم سطور کو ملے ہیں، یہاں اس مراسلت کی معلوم تفصیل اور نو دریافت، دونوں خطوط کا تعارف اور متن پہلی بار شائع ہو رہے ہیں۔

بیگم سلطان جہاں کی حضرت مولانا سے ارادت ومحبت، کہنا چاہئے ایک آبائی سلسلہ کی توسیع وتکمیل تھی۔ بیگم صاحب کی والدہ محترمہ، نواب شاہجہاں بیگم بھی، حضرت مولانا کے مراتب وکمالات کی قدرداں اور معترف تھیں، جب حضرت مولانا سفر حج سے واپسی کے وقت، اپنے علاج کے ارادہ سے، ریاست اندور میں قیام پذیر تھے، اس وقت نواب شاہجہاں بیگم بھی اندور میں نزول فرما ہوئی تھیں، اور جب ان کو، اندور

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۱۰۳، ج:۲ [عکس طبع اول۔ سہارنپور: ۱۹۷۷ء]

(۲) نزھۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی۔ ص:۱۷۲، ج:۸ [دائرۃ المعارف حیدرآباد: ۱۴۰۳ھ۔ ۱۹۸۱ء]

میں حضرت مولانا کے قیام اور علالت کی خبر ملی، تو بیگم صاحبہ نے آ کر مزاج پرسی کی اور دو سو روپئے کی گراں قدر رقم، حضرت مولانا کی خدمت میں ہدیۂ نیاز کے طور پر پیش کرنے کی مسرت حاصل کی تھی۔ یہ واقعہ بیگم سلطان جہاں کے علم میں بھی آیا ہوگا، اس کے علاوہ بیگم سلطان جہاں کے شوہر، مشہور و ممتاز عالم، مولانا نواب سید صدیق خاں بھی، حضرت مولانا سے واقف ہوں گے۔ مولانا نواب صدیق حسن خاں اور حضرت مولانا گنگوہی کے نام علمی افق پر چمکتے تھے، بہت ممکن ہے کہ نواب صاحب کی حضرت مولانا سے ذاتی واقفیت، ملاقاتیں اور خط و کتابت وغیرہ بھی رہی ہو، اس وجہ سے بھی بیگم سلطان جہاں کی، حضرت مولانا سے عقیدت میں اضافہ ہوا ہوگا اور ارادت و بیعت کے خیال میں مضبوطی آئی ہوگی۔

جب بیگم سلطان جہاں صاحبہ نے، حضرت مولانا گنگوہی کے دامن تربیت سے وابستہ ہونے اور بیعت ہونے کا فیصلہ کرلیا، تو حضرت مولانا سے بیعت قبول کرنے کی درخواست کی اور اس مقصد کے لئے ایک عریضہ لکھوا کر، اپنے قائم مقام میر منشی، منشی منصب علی کنجپوری کے ذریعہ سے، حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچایا، حضرت مولانا نے اس کے جواب میں تأمل کیا، بیگم صاحب نے کسی قدر انتظار کے بعد، منشی جی کے ذریعہ ہی سے، ایک اور خط حضرت مولانا کی خدمت میں روانہ کردیا، حضرت مولانا نے اس کے جواب میں، بیعت قبول کرنے کے سلسلہ میں، اپنے اصول اور خصوصاً بیگم صاحبہ کی، حضرت مولانا سے وابستگی کے لئے چند کڑی شرائط پیش فرمائیں:

بیگم صاحب نے ان تمام شرائط اور حضرت مولانا کی ہدایات کی، تکمیل و تعمیل کے ارادہ کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے معتمد خاص، مولانا قاضی محی الدین صاحب مراد آبادی[1] کو، ایک اور خط دے کر گنگوہ

(۱) قاضی محی الدین خلف شبیر حسن، بن رفیع الدین بن عظمت اللہ لکھنوی ثم مراد آبادی [حضرت مولانا محمد قاسم کے شاگرد] مولانا محمد احسن مراد آبادی سے تعلیم حاصل کی، حضرت مولانا سے براہ راست بھی پڑھا، استفادہ کیا۔ ۱۳۲۲ھ [۵-۱۹۰۴ء] میں ریاست بھوپال میں قاضی مقرر کئے گئے، شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال میں شرکت کے الزام کی وجہ سے قاضی کے منصب سے علیحدہ کردیئے گئے تھے، ۱۳۱۹ھ میں مستعفی ہو کر وطن مراد آباد واپس آ گئے تھے۔ مراد آباد میں مختلف دینی خدمات میں مصروف رہے، مدرسہ شاہی مراد آباد کے رکن شوری اور مہتمم رہے۔ قاضی وجدی الحسینی نے قضاۃ و مفتیان بھوپال ص:۲۸۶، [بھوپال: ۱۹۸۶ء] میں قاضی صاحب کا سنہ وفات ۱۳۴۶ھ لکھا ہے، لیکن ندائے شاہی مراد آباد کے، مدرسہ شاہی نمبر میں ۱۳۴۸ھ تحریر ہے [ص:۲۲۹] بظاہر یہی صحیح ہے۔

بھیجا، اور بیعت قبول کر لینے کی مکرر درخواست کی، حضرت مولانا نے قاضی صاحب کے ذریعہ غائبانہ بیعت قبول فرمالی۔ قاضی محی الدین صاحب یہ خوش خبری لے کر بھوپال واپس ہو گئے، بیگم سلطان جہاں کو اس نعمت اور عزت افزائی سے بے حد خوشی ہوئی، اس کے شکریہ اور بیعت قبول کر لینے کی عنایت کا، بطور خاص شکریہ ادا کرنے اور حضرت کی ہدایات اور معمولات پر اہتمام سے عمل کرنے کے فیصلہ سے، حضرت مولانا کو آگاہ کرنے کے لئے تیسرا خط تحریر کیا، یہ مکتوب بھی منشی منصب علی صاحب لے کر آئے تھے، مگر وہ جس دن گنگوہ پہنچے، اسی دن حضرت مولانا کی وفات ہو گئی تھی، اس طرح کل پانچ خطوط کا تبادلہ ہوا، چار خط بیگم صاحب بھوپال کے آئے، ایک والا نامہ حضرت مولانا نے تحریر کیا۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں، ان میں سے صرف تین خطوط کا ذکر کیا ہے، جس میں سے دو خطوں کا متن تذکرۃ الرشید میں شامل ہے، اس سلسلہ کے سب سے پہلے اور آخری خط کا، مولانا میرٹھی کو غالباً علم نہیں ہوا، اسی لئے مولانا میرٹھی نے ان دونوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کے علاوہ مولانا میرٹھی کے یہاں ترتیب واقعات بھی مکمل اور درست نہیں ہے۔ مولانا نے لکھا ہے:

> ''رئیسہ ممدوحہ کو اعلیٰ حضرت کے خلفاء میں، حضرت امام ربانی قدس سرہ کے سوائے کسی کی طرف عقیدت نہ ہوئی، چنانچہ مراسلت شروع ہوئی۔ اول حضرت امام ربانی نے حسب عادت انکار فرمایا اور درخواست کے جواب میں، ملیح طرز سے طلب کا امتحان لیا، مگر خوش نصیب وعفت مآب خاتون کی طلب، حقیقت میں سچی اور پختہ طلب تھی، اس کے لئے درخواست کی اوائل ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ ہجری نبوی میں، حضرت کے مخلص متوسل جناب مولانا قاضی محی الدین صاحب مرادآبادی، قاضی ریاست بھوپال، ممدوحہ کا والا نامہ لے کر، وکیل وسفیر بن کر گنگوہ تشریف لائے اور حضرت قدس سرہ نے رئیسہ کی بیعت قبول فرمائی''[1]

اس کے بعد تحریر ہے:

> ''میر منصب علی صاحب منشی دام مجدہ کی وساطت سے، یکے بعد دیگرے دو خطوط اسی

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۱۰۳۔ ج:۲ [عکس طبع اول، سہارنپور:۱۹۷۰ء]

درخواست میں حضرت امام ربانی کے پاس پہنچ چکے تھے، اس کا جواب حضرت قدس سرہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔“[۱]

مگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں، نہ حضرت مولانا نے پہلا خط موصول ہونے پر، بیگم صاحب کو بیعت کیا، نہ وہ خط قاضی محی الدین صاحب لے کر آئے تھے۔ بیگم صاحب نے پہلا مکتوب، جس میں بیعت کی درخواست تھی، اپنے قائم مقام میر منشی، منشی منصب علی صاحب کنجپوری کے ذریعہ روانہ کیا تھا، یہ خط ۱۷رصفر ۱۳۲۳ھ[۲۳/اپریل ۱۹۰۵ء] کا لکھا ہوا ہے۔

حضرت مولانا نے کسی خاص مصلحت سے، اپنے اصول ومعمول کے خلاف اس کا جواب تحریر نہیں کیا تھا، اپنے پہلے خط کا جواب نہ ملنے پر، فرط شوق میں اور اپنی گذارش پر جلد توجہ کے لئے، حضرت مولانا کی خدمت میں ایک عریضہ اور ارسال کر دیا، اس خط کی تاریخ تحریر میں بھی مولانا میرٹھی کو سہو ہوا، مولانا نے اس کی تاریخ، ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ[۱۹۰۵ء] لکھی ہے، جو خلاف واقعہ ہے، یہ خط ربیع الاول میں لکھا گیا تھا، ربیع الثانی صحیح نہیں۔

حضرت مولانا نے اس کے جواب میں ارقام فرمایا کہ:

”بیعت دو وجہ سے کی جاتی ہے، ایک تو بغرض تحصیل نسبت وحصول برکات طریقت، اس کے لئے ایک مدت دراز، مرشد کے پاس رہنا ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ میں وہاں آسکتا ہوں اور نہ بیگم صاحبہ کی یہاں تشریف آوری مناسب ہے اور بدون اس کے یہ بیعت بیکار ہے ـــــــ دوسری بیعت، بغرض شرکت وتعلق بزرگان ہے، جس میں محض دخول سلسلہ ہوتا ہے اور اس کو اول تو بندہ کچھ مفید نہیں جانتا، دوسرا اس وجہ سے، رئیسہ دام اقبالہا کو، جو میرے حال پر نظر عنایت وتوجہ اور التفات ہوگی، اس سے مجھے سخت ندامت ہوگی، نیز اس کی شہرت سے اہل حاجات بھی بندہ کو روز روز تنگ کریں گے، جن میں سے کسی کی سعی وسفارش مناسب ہوگی، کسی کی غیر مناسب! پھر یہ کہ جب رئیسہ دام اقبالہا کو میرے ساتھ محبت واخلاص ہے، تو یہ تعلق واتحاد حاصل ہے۔

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۱۰۳۔ ج:۲[عکس طبع اول، سہارنپور: ۱۹۷۰ء]

بایں ہمہ اگر اصرار ہو، تو دو شرط سے منظور ہے، ایک یہ کہ میرے ساتھ قدیمی برتاؤ میں
کوئی تفاوت نہ آئے اور میرے ساتھ کسی قسم کی مروت واحسان نہ ہو، دوسرے اس
امر کا اظہار نہ ہو، اگر یہ دونوں امر منظور ہوں، تو میں ان کی بیعت اس امر پر قبول
کرتا ہوں کہ اتباع سنت اور اجتناب بدعت کو اپنا شعار رکھیں اور حق پرستی وعدل گستری
وانصاف سے، رعایا پروری میں مصروف رہیں۔ والسلام [1]

بیگم صاحب نے اس کے جواب میں ان ہدایات پر عمل کا ارادہ اور وعدہ کیا، اس مرتبہ بیگم صاحب کا عریضہ لے کر، مولانا قاضی محی الدین مرادآبادی گنگوہ آئے تھے، منشی منصب علی بھی ساتھ تھے۔ قاضی محی الدین، حضرت مولانا کے متوسلین میں سے تھے، حضرت مولانا نے قاضی صاحب کی فرمائش پر، بیگم صاحب کی غائبانہ بیعت قبول فرمالی، قاضی صاحب یہ خوش خبری لے کر، بھوپال واپس گئے، بیگم صاحب کو اپنی درخواست کی منظوری اور حضرت مولانا سے بیعت ہونے کی، کس قدر خوشی ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بیگم صاحب نے اس اعزاز کے حاصل ہونے اور خود کو حضرت کے نیازمندوں میں سے، شمار کئے جانے کے شکریہ میں، حضرت کی خدمت میں ایک خط اور روانہ کیا، جس میں قبول بیعت پر تشکر اور بیعت کے علاوہ، تعلق مع اللہ بڑھانے کے لئے، خاص معمولات اور طریقہ پر عمل کرنے کے ارادہ کی، اطلاع کی گئی تھی مگر یہ حضرت مولانا کی زندگی کے آخری ایام تھے، حضرت مولانا کا وہ مرض شروع ہو چکا تھا، جو مرض وفات ثابت ہوا، بیگم صاحب کو بھی، حضرت مولانا کی اس شدت علالت کی اطلاع تھی، بیگم کے اس خط میں، حضرت مولانا کی مزاج پرسی اور صحت وعافیت کے لئے دعا بھی کی گئی تھی۔ یہ بیگم صاحب کا، حضرت مولانا کے نام آخری خط ثابت ہوا، یہ خط جو حضرت مولانا کی وفات سے تین دن پہلے [۶/ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ۔ ۹/ اگست ۱۹۰۵ء] کو لکھا گیا تھا۔

بیگم صاحب نے یہ خط بھی، اپنے ذمہ دار نمائندے، منشی منصب علی کے ذریعہ سے، دست بہ دست حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے، منشی صاحب کے حوالہ کرکے، ان کو بھوپال سے گنگوہ بھیجا تھا، مگر اسی دوران غالباً حضرت مولانا کا سفر آخرت پیش آ چکا تھا۔ معلوم نہیں کہ منشی منصب علی،

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۱۰۴۔ ج:۲

حضرت مولانا کی زندگی میں گنگوہ پہنچ گئے تھے یا وفات کے بعد پہنچنا ہوا، بہرحال اس اہم مراسلت میں صرف پانچ خطوط کا تبادلہ ہوا تھا، جو اور حضرت مولانا گنگوہی کی [۸/ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ-۱۱/ اگست ۱۹۰۵ء] کو وفات کی وجہ سے، صرف چار مہینہ کی مختصر مدت میں اس کا اختتام بھی ہو گیا تھا۔ وللّٰہ الامر من قبل و من بعد!

ان خطوط کی اہمیت: یہ خطوط ہمارے دینی ملی سیاسی تاریخ کا ایک یادگار حصہ ہیں، ان کے کاتب اور مکتوب الیہ دونوں بڑے مرتبہ پر فائز تھے، بیگم صاحب نے اپنی جاہ و منزلت، ملک کے اہل سیاست واقتدار اور ملک کے بلند ایوانوں میں، اپنے اعزاز ومنصب کے باوجود، روحانی ضروریات کا بھرپور احساس کیا، تربیت اخلاق اور نسبت مع اللہ حاصل کرنے کا جذبہ، ان کے دل میں موجزن رہا، جو بیگم صاحب کے معلوم کمالات پر ایک بڑا اضافہ ہے۔

بیگم سلطان جہاں اور حضرت مولانا گنگوہی کے خطوط کے مطالعہ سے پہلے مناسب ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم کا بھی کسی قدر تعارف کرا دیا جائے۔ بیگم صاحب کی زندگی، خدمات اور احوال پر یوں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر نواب صاحب کی وفات پر، علامہ سید سلیمان ندوی نے جو تعزیتی تحریر لکھی تھی، اس کو مکتوبات کے مطالعہ سے پہلے پڑھ لیجئے، تاکہ مکتوب الیہ کی جلالت شان کے ساتھ، مکتوب نگار کے سطوت ومنصب اور مقام ومرتبہ کا بھی کچھ خیال رہے۔

بیگم سلطان جہاں: بیگم سلطان جہاں، برصغیر کی دینی علمی سیاسی تاریخ کی، ایک ممتاز شخصیت اور علمی دینی خدمات کی ایک بڑی محسن اور مربی تھیں، ملک کے کم دینی علمی ادارے، تحقیقی تصنیفی مراکز ایسے ہوں گے، جو بیگم صاحب کی سخاوت وفیاضی سے فیضیاب نہ ہوئے ہوں۔ بے شمار علماء اور اہل روحانیت وکمال تھے، جن کو بیگم سلطان جہاں کے دولت خانہ سے وظیفہ اور ماہانہ یا سالانہ ایک رقم موصول ہوتی تھی دارالعلوم دیوبند ہو، مظاہر علوم سہارنپور ہو، یا علی گڈھ اور دارالمصنفین یا دوسرے علمی تصنیفی مراکز، سب کو وظیفے ملتے اور ہر اک کو آگے بڑھنے ترقی کرنے کے لئے، وسائل فراہم کئے جاتے تھے۔ بیگم صاحب کی علم پروری، علم اور علماء کی قدر افزائی اور دینی علمی اداروں کے قیام، ان کے احیاء اور ترقی میں، بیگم صاحب کی خدمات وعنایات کو آج تک یاد کیا جاتا ہے، اور یاد کیا جاتا رہے گا]۔

ہمارے قصبہ کاندھلہ [ضلع مظفرنگر، شمالی یوپی] کی شاندار و دل آویز عیدگاہ بھی، بیگم صاحب کی سخاوت وکرم فرمائی کی ممنون ہے۔ جی چاہتا ہے اس احسان اور سخاوت کا بھی، یہاں ذکر کر دیا جائے:

بیگم سلطان جہاں کا کاندھلہ کی عیدگاہ کی تعمیر میں گراں قدر تعاون: اہل کاندھلہ نے، کاندھلہ میں عیدگاہ کی تعمیر شروع کی تھی، جس کے لئے اہل قصبہ اور دیہات کے مخلصین نے بھرپور تعاون کیا اور دو تین مرتبہ کوششیں کر کے، دس ہزار کی رقم فراہم کر لی تھی، مگر اس میں عیدگاہ کی تعمیر کا منصوبہ مکمل نہ ہوسکا، بلند عالی شان میناروں کی تکمیل وتعمیر کا کام ناتمام رہ گیا تھا، اہل قصبہ مزید رقم فراہم کرنے سے عاجز ہو گئے، غور وفکر کے بعد اس خدمت وگذارش کے لئے، بیگم صاحب پر نظر گئی۔ اہل کاندھلہ کی دربار بھوپال سے وابستگی پرانی تھی، بیگم سلطان جہاں کے والد، نواب سلطان دولہا بھی کاندھلہ کی قریبی بستی، جلال آباد کے باشندے تھے، اس لئے بھی سب کی نگاہیں بیگم صاحب پر گئیں، بیگم صاحب سے درخواست کی گئی کہ ہماری عیدگاہ کی تعمیر کا کام چل رہا ہے، میناروں کی تعمیر کا کام باقی ہے، مگر رقم ختم ہوگئی، یہاں کے لوگوں میں مزید تعاون کی گنجائش نہیں، اس لئے درخواست ہے کہ مدد کی جائے۔ بیگم صاحب نے فوراً ہی دو ہزار روپئے دیئے جانے کے احکامات دیدیئے، اس سے عیدگاہ کاندھلہ کے مینار، جو پچاس فٹ اونچے ہیں، مکمل ہوگئے، اور اب تک دیکھنے والوں کے لئے کشش اور توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

نواب سلطان جہاں [جو بعد میں نواب یا بیگم سلطان جہاں کے نام سے مشہور وممتاز ہوئیں] نواب باقی محمد کی دختر تھیں، [1] جو والیہ بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر تھے، ۲۷ ۱۲۷۴ھ [۹/ جولائی ۱۸۵۸ء] میں تولد ہوئیں۔

ریاست بھوپال کے نہایت بڑے عالم، صاحب زہد وتقویٰ اور مجموعہ کمالات انسانی، منشی جمال الدین کوتانوی [مدار المہام، وزیر اعظم بھوپال] سے قرآن مجید اور قرآن مجید کا اردو ترجمہ پڑھا، فارسی اردو کی

(۱) نزہۃ الخواطر میں سلطان جہاں کا صرف مادری نسب نامہ لکھا ہے، جو اس طرح ہے:

"سلطان جهاں بيگم بنت شاهجهاں بيگم، بنت سكندر بيگم ملكه بهوپال"

ص:۱۷۳، ج:۸ [حیدر آباد: ۱۴۰۲ھ-۱۹۸۱ء]

تینوں بیگمات کے والد یا شوہروں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

ابتدائی کتابیں، مولانا مفتی محمد ایوب پھلتی سے پڑھیں۔ اپنی والدہ، نواب سکندر جہاں سے آداب حکومت اخذ کئے اور طریقہ سیاست سیکھا۔ اکثر علوم وفنون میں ماہر اور صاحب نظر تھیں۔

جلیل القدر فاضلہ، مصنفہ اور عمدہ مقررہ تھیں، ہندوستان کے بڑے بڑے دینی کاموں اور علماء کی سرپرستی اور مالی امداد میں، اہل زمانہ کی پیشوا اور ممتاز تھیں، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی چانسلر تھیں، دار المصنفین اعظم گڈھ کی سرپرست اعلیٰ تھیں، بیگم صاحبہ نے دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم وغیرہ کے علاوہ، بہت سے دینی تعلیمی اشاعتی اداروں کے لئے، سالانہ یا ماہانہ عطیات اور وظیفے جاری کئے تھے، جو برسوں تک ان سب کو ملتے رہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی [صلی اللہ علیہ وسلم] کی تالیف بھی، بیگم صاحب کی شاہانہ فیاضی کی ممنون کرم ہے۔

نواب احمد علی خاں [لوہاری، ضلع مظفر نگر یوپی] سے نکاح ہوا، شادی کے بعد، نواب احمد علی خاں کو سلطان دولہا کا خطاب ملا۔[۱]

۱۳۱۹ھ [۱۹۰۱ء] سریر آرائے حکومت ہوئیں، تقریباً بیس سال حکومت کی، ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ [اپریل ۱۹۳۰ء] میں وفات ہوئی، بھوپال میں دفن کی گئیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی یادگار تحریر: بیگم سلطان جہاں کی وفات پر پورے ملک نے ماتم کیا، اخبارات ورسائل نے تعزیتی شذرے شائع کئے، بیسوں مضامین لکھے گئے، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا، لیکن اس حادثہ پر، علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف کے صفحات پر جو کچھ لکھا تھا، وہ بے مثال ہے۔ علامہ سید سلیمان نے بیگم صاحبہ کو **مخدومۂ ملت** سے یاد کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> علیا حضرت کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے، جس کا ماتم نہ صرف بھوپال، نہ صرف ہندوستان، نہ صرف مسلمان، بلکہ تمام دنیا کر رہی ہے، اور کرے گی۔ وہ نہ صرف اسلام کی، بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں، جن کے کارناموں پر مرو سلاطین

(۱) نواب سلطان دولہا کا مدفن، تھانہ بھون سے جلال آباد جاتے ہوئے، سڑک کے کنارے، دائیں جانب بنے ہوئے ایک مختصر احاطہ میں ہے۔

اور امراء بھی رشک کر سکتے ہیں، ان کا دور حکومت میں جو تیس سال سے کم نہیں رہا، بھوپال کا تاریخ کا زریں عہد ہے۔

سلطانہ مرحوم، مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا مجمع البحرین تھیں، جو آج مصلحین امت کا آئیڈیل ہے، ان کی مشرقی تعلیم پوری اور مغربی واقفیت بقدر ضرورت تھی، وہ نہ صرف فرماں رواں تھیں، بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما، مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کی رئیسہ علیا، مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی حامی، مذہبی علوم و فنون کی سب سے بڑی سرپرست، ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مبلغ، مسلمان عورتوں میں سب سے بڑی کثیر التصانیف، اور سب سے بہتر مقررہ، لیکن ان ہر قسم کے انتظامی، اصلاحی، ملکی، علمی، اور تعلیمی کارناموں سے بڑھ کر، ان کا حقیقی شرف، ان کی مذہبی گرویدگی، دینی عقیدت اور ایمانی جوش و ولولہ تھا۔

وہ ہر قومی، مذہبی و علمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتی تھیں، اور اس کے لئے عملی قدم اٹھاتی تھیں، مسلم یونیورسٹی، مدرسہ دیوبند، دار العلوم ندوہ اور ووکنگ مشن، چھوٹے بڑے بیسیوں تعلیمی و مذہبی ادارے، ان کی امداد و اعانت کے طوق منت سے گراں بار ہیں۔ دار المصنفین اور سیرت نبوی کو کہا جائے، کہ انہیں کے دست کرم سے ان کی بنیاد پڑی، خصوصاً سیرت النبی جیسی اہم کتاب کا عالم وجود میں آنے کا شرف، ان کی ذات گرامی کے لئے مخصوص ہے، امید ہے کہ تنہا ان کی یہی نیکی، شفاعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استحقاق کے لئے کافی ہوگی۔

سلطانہ مرحومہ کی ہستی میں رعب و شفقت کی عجیب آمیزش تھی، اور ان کے اخلاق میں عجیب کشش تھی، ان کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا تھا، دربار کے آداب بھی تمام تر شرعی تھے، پردہ کے پیچھے وہ تشریف رکھتی تھیں، کورنش و تسلیمات و رکوع و سجود کا وہاں دخل نہ تھا، سب سے پہلے السلام علیکم کی بلند آواز ان کی طرف سے آتی تھی، شاید ہی کوئی ان

سے ملا ہو، اوران کے اخلاق ومعلومات کی وسعت سے وہ متاثر نہ ہوا ہو۔ علامہ شبلی مرحوم، غالباً ۱۹۰۶ء میں ان سے ملے تو ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے جذبات، الندوہ کے چند صفحات میں ظاہر کئے، مجھے دو تین مرتبہ ان کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا، مگر ہر دفعہ دیر تک وہ اس اخلاق سے مصروف کلام رہیں کہ مخاطب یہ بھول جاتا تھا کہ وہ کسی خودمختار فرماں رواں سے باتیں کررہا ہے۔

ان کو تصنیف وتالیف کا شوق تھا اور اس کے لئے ایک خاص محکمہ تھا، اس سلسلہ میں ان کے مسودات بارہا دیکھے، ان کے برمحل اعتراض اور باموقع سوجھ، حیرت انگیز تھی۔ اپنی تصنیفات کے مسودوں پر وہ خود نظر ثانی کرتی تھیں اور اپنے قلم سے ان پر نشان بناتی تھیں۔

ان کو رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بے مثال عقیدت تھی، جس کی کھلی دلیل خود سیرت نبوی کا وجود ہے، مگر اس کے علاوہ ان کی گفتگو تحریر، تقریر، ہر چیز سے، ان کا یہ جذبہ ظاہر ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں سیرت کی پہلی جلد لے کر، جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو بڑے اشتیاق سے، انہوں نے دریافت کیا تھا کہ عالم رویا میں رسول انام علیہ السلام کی زیارت کس طرح ہوسکتی ہے۔ عرض کی کہ کتب حدیث وسیرت کے مطالعہ اور درودوسلام کی کثرت سے۔[۱]

آخر میں نواب سلطان جہاں بیگم اور حضرت مولانا گنگوہی کے خطوط حسب ترتیب تاریخ تحریر، پڑھئے اور سوچئے کہ ہمارے سے کچھ ہی پہلے، معروف اہل دنیا بھی کس قدر مخلص اور اللہ سے لو لگانے والے ہوتے تھے اور آج ہمارا دور ہے کہ مذہبی طبقہ کے بہت سے افراد بھی، معمولی اہل دنیا کے ہم رنگ بنے ہوئے ہیں۔

---

(۱) ماہ نامہ معارف اعظم گڈھ ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ۔ مئی ۱۹۳۰ء۔ مشمولہ یادرفتگاں، علامہ سید سلیمان ندوی ص:۱۱۲۔۱۱۵ [مکتبہ الشرق، کراچی:۱۹۵۵ء]

مکتوبات

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے بیگم سلطان جہاں اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی مراسلت میں سے تین خطوں کا تذکرہ کیا ہے، حضرت مولانا گنگوہی کے گرامی نامہ میں ایک خط کا اور ذکر ہے، جس پر مولانا میرٹھی نے کوئی روشنی نہیں ڈالی، ایک خط مذکورہ تصریحات کے علاوہ ہے، جو بیگم صاحب نے بیعت کے بعد لکھا تھا، اس طرح کل پانچ خطوط ہیں، ان میں سے تیسرا چوتھا خط، مولانا میرٹھی نے نقل کیا ہے، پہلا اور سب سے آخری، یعنی پانچواں خط، جس کا مولانا میرٹھی نے تذکرہ نہیں کیا، راقم کے ذخیرہ میں اضافہ ہوا ہے، دونوں کے متن پہلی مرتبہ ان صفحات کے ذریعہ سے پیش کئے جارہے ہیں، ایک خط ہنوز نامعلوم ہے، اس کا سراغ نہیں ملا، تاہم جو دو خط مل گئے ہیں، وہ بھی اس عنوان پر کافی روشنی ڈال رہے ہیں۔ پانچوں خطوط تاریخ تحریر کے مطابق، ترتیب وار ملاحظہ ہوں:

مکتوب اول

بیگم صاحب نے بیعت قبول کرنے کے لئے، حضرت مولانا کی خدمت میں پہلی عرض داشت، ۱۷رصفر ۱۳۲۳ھ۔ ۲۳راپریل ۱۹۰۵ء کو قلم بند کرائی تھی، اس کو لے کر منشی منصب علی کنج پوری، حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے مگر مولانا عاشق الٰہی اس مکتوب کا، جو اس مراسلت کا سر آغاز ہے، تذکرہ نہیں کرتے، لیکن حضرت مولانا گنگوہی نے بیگم صاحب کو جو گرامی نامہ ارقام فرمایا تھا، اس میں صراحت ہے کہ:

> ’’آپ کا عنایت نامہ مشتمل بر استدعاے بیعت، نواب سلطان جہاں بیگم صاحب کئی روز ہوئے آیا تھا، مگر چوں کہ بہ تقضائے سن و بوجہ عروض عوارض مختلفہ، میری طبیعت مضمحل رہتی ہے، نیز دوبارہ تحریر جواب مجھے تردد بھی تھا، اس لئے تحریر جواب کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی کہ آپ کا دوسرا عنایت نامہ، بغرض تقاضائے جواب آ گیا ہے، اس لئے جواب لکھواتا ہوں‘‘ [1]

یعنی بیگم صاحب کے پہلے خط کا جواب نہیں گیا تھا، کہ پہلے خط کے مضمون کی مکرر درخواست پر مشتمل، ایک اور عریضہ لے کر، یہی منشی منصب علی صاحب دوبارہ گنگوہ پہنچے۔ ان میں سے پہلا خط جس کا

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۱۰۳، ص:۱۰۴۔ ج:۲

مولانا عاشق الٰہی نے تذکرہ نہیں کیا، ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے اس میں بیگم صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

●

بیگم سلطان جہاں بنام حضرت مولانا گنگوہی

آرزو دارم کہ خاک آں قدم
تو تیائے چشم سازم دم بدم

سالک مسالک خدادانی وخداشناسی، حضرت مولانا واولانا

جناب مولوی رشید احمد صاحب، دام فیوضہ

نیاز بنیان فقیر منصب علی گنج پوری ثم البھوپالی، بکمال ادب وانکسار ہدیہ سلام سنت خیر الانام علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والسلام، پیش خدمت حاشیہ بوسان بساط فیض مناط کر کے، عارض مدعا ہے کہ جناب والا پر مخفی نہ ہوگا کہ میری آقائے نامدار، نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کو فقیر اور علماء سے نہایت مؤدت ومحبت ہے۔

اور آج طبقۂ خاتونان ہند میں تو کیا، مستورات عالم میں قادر وبے ہماں نے ان کی ذات کو فرد وبے مثال بنایا ہے، دینی ودنیاوی جوجو جوہر ان کی ذات میں، ایزد تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ آں جناب کے تقدس وتقویٰ وعلم ورع کے حالات معلوم کر کے، ایک عرصہ سے دلی عقیدت مند ہیں، چنانچہ بر سبیل تذکرہ آج حضور ممدوحہ نے ارشاد فرمایا ہے، کہ جب میں حج کو جاتی تھی تو بنظر حصول خیر وبرکت، مولانا رشید احمد صاحب کو ساتھ چلنے کی تکلیف دی تھی، لیکن مولوی صاحب ممدوح نے منظور نہ فرمایا۔

مجھ کو ایک عرصہ سے عالم وکامل کی تجسس وتلاش ہے، اس وقت تک جہاں تک مجھ کو معلوم ہوا ہے، مولوی رشید احمد صاحب کی ذات فیض آیات پر کسی کو ترجیح دینا پسند نہیں کرتی، الحمد للہ کہ اتباع شریعت پر تو مجھ کو کامل وثوق ہے، مگر مسلک طریقت سے نا آشنائے محض اور اس کی کمال آرزو مند ہوں، کوئی عالم باعمل ایسے بزرگ ملیں، جن کے فیضان عنایت سے، نفس کی نفسانیت دور ہو اور زنگ قلبی کو صیقل ہو جائے۔

فی زماننا بجز مولانا رشید احمد صاحب کے میری نظر کسی اور طرف نہیں جاتی، مگر مشکل یہ ہے کہ مولانا صاحب تشریف لانا منظور نہیں فرماتے اور میرا گنگوہ جانا ہو نہیں سکتا۔

لہٰذا، مولانا صاحب کی خدمت میں تو عریضہ لکھ دے، کہ مجھ کو بیعت کرنا قبول فرمائیں اور ادعیہ

واوراد ماثورہ تعلیم وتلقین فرمائیں، تا کہ طریقت کی نعمت سے محروم نہ رہوں۔ بتعمیل ارشاد یہ عریضہ خدمت بابرکت میں ارسال کرتا ہوں۔

امید ہے کہ شرف اجابت سے، بحکم:''اما السائل فلا تنھر'' معزز فرمائیں گے اور جواب باصواب سے بأسرع اوقات ممتاز کیا جاؤں گا۔

مؤرخہ ہفتد ہم صفر ختم اللہ بالخیر والظفر ۱۳۲۳ھ

عریضہ گذار

خادم السادات فقیر منصب علی نجپوری

نائب اول میر منشی صیغۂ مخفیات

حال قائم مقام میر منشی ریاست بھوپال[۱]

مکتوب دوم

یہ خط دستیاب نہیں ہوا مگر حضرت مولانا گنگوہی نے جو گرامی نامہ تحریر کیا تھا، وہ اسی دوسرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

''آپ کا عنایت نامہ مشتمل بر استدعائے بیعت، نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کئی روز ہوئے آیا تھا، مگر چوں کہ بمقتضائے سن وبوجہ عروض عوارض مختلفہ، میری طبیعت مضمحل رہتی ہے، نیز در بارہ تحریر جواب مجھے تردد بھی تھا، اس لئے تحریر جواب کی ہنوز نوبت نہیں آئی تھی کہ آپ کا دوسرا عنایت نامہ، بغرض تقاضائے جواب آ گیا، اس لئے جواب لکھواتا ہوں۔''[۲]

مکتوب سوم

مکتوب حضرت مولانا گنگوہی بنام بیگم سلطان جہاں

حضرت مولانا گنگوہی کے جس گرامی نامہ کی چند سطریں اوپر نقل ہوئی ہیں، یہاں پڑھ لیجئے،

(۱) یہ نادر ترین تاریخی مکتوب، محبّ مکرم مولانا حکیم رضی الدین احمد صاحب [پھلت، کھتولی، مظفر نگر، یوپی] نے راقم کو عنایت کیا ہے، حکیم صاحب کو یہ خط مولانا حکیم محمد عمر تھانوی [سابق پرنسپل طبیہ کالج، دارالعلوم، دیوبند] نے عنایت فرمایا تھا۔ فجزاھما اللّٰہ تعالیٰ خیر الجزاء

(۲) تذکرۃ الرشید ص:۱۰۳-۱۰۴۔ ج:۲

حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ:

''از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ عنایت فرمائے برحال بندہ۔ بعد سلام مسنون الاسلام مطالعہ فرمایند بندہ بخیریت ہے آپ کے لئے دست بدعا ہے، آپ کا عنایت نامہ مشتمل براستدعاے بیعت، نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کئی روز ہوئے آیا تھا، مگر چونکہ بمقتضائے سن وبوجہ عروض عوارض، مختلفہ میری طبیعت مضمحل رہتی ہے، نیز دربارہ تحریر جواب مجھے تردد بھی تھا، اس لئے تحریر جواب کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی، کہ آپ کا دوسرا عنایت نامہ بغرض تقاضائے جواب آ گیا، اس لئے اب جواب لکھواتا ہوں کہ بیعت دووجہ سے کی جاتی ہے، ایک تو بغرض تحصیل نسبت وحصول برکات طریقت، اس کے لئے ایک مدت دراز مرشد کے پاس رہنا ضروری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ نہ میں وہاں آسکتا ہوں نہ بیگم صاحبہ کی یہاں تشریف آوری مناسب ہے اور بدون اس کے یہ بیعت بیکار ہے۔ دوسری بیعت، بغرض شرکت وتعلق بزرگان ہے، جس میں محض دخول سلسلہ ہوتا ہے اور اس کو اول تو بندہ کچھ مفید نہیں جانتا، دوسرا اس وجہ سے، رئیسہ دام اقبالہا کو، جو میرے حال پر نظر عنایت وتوجہ اور التفات ہوگی، اس سے مجھے سخت ندامت ہوگی، نیز اس کی شہرت سے اہل حاجات بھی بندہ کو روز روز تنگ کریں گے، جن میں سے کسی کی سعی وسفارش مناسب ہوگی، کسی کی غیر مناسب! پھر یہ کہ جب رئیسہ دام اقبالہا کو میرے ساتھ محبت واخلاص ہے، تو یہ تعلق واتحاد حاصل ہے۔

بایں ہمہ اگر اصرار ہو، تو دو شرط سے منظور ہے، ایک یہ کہ میرے ساتھ قدیمی برتاؤ میں کوئی تفاوت نہ آئے اور میرے ساتھ کسی قسم کی مروت واحسان نہ ہو، دوسرے اس امر کا اظہار نہ ہو، اگر یہ دونوں امر منظور ہوں، تو میں ان کی بیعت اس امر پر قبول کرتا ہوں، کہ اتباع سنت اور اجتناب بدعت کو اپنا شعار رکھیں اور حق پرستی وعدل گستری وانصاف سے، رعایا پروری میں مصروف رہیں۔ والسلام

مکتوب چہارم

بیگم سلطان جہاں بنام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

حضرت مولانا کے درج بالا گرامی نامہ کو، بیگم صاحب اپنی تمنا کے پورا ہونے اور حضرت مولانا کی

جانب سے بیعت قبول کرنے کے خیال کا اظہار سمجھ کر، اپنے معتمد منشی منصب علی سے ایک اور درخواست بیعت لکھوا کر، حضرت مولانا کی خدمت میں، مولانا قاضی محی الدین مرادآبادی کے ذریعہ ارسال فرمائی، جس میں بیعت قبول کر لینے کی درخواست کو دہرایا گیا تھا، یہ خط جو ۲/ربیع الثانی کو لکھا گیا، درج ذیل کلمات وسطور پر مشتمل تھا۔ بیگم سلطان جہاں نے تحریر کیا:

بجناب فضائل مآب حقیقت انتساب حضرت مولانا رشید احمد صاحب دام فیوضہ

بعد سلام سنت الاسلام! انجاح مرام آنکہ، مکرمت نامہ سامی، میرے منشی سید منصب علی کے نام صادر ہوا، اس کے جواب میں منصب علی کا عریضہ اور مولوی محمد محی الدین احمد صاحب، قاضی ریاست، حاضر خدمت سراپا برکت ہوتے ہیں، میرا مدعا منصب علی کی نگارش اور قاضی صاحب معز کی زبانی گذارش سے، مبرہن خاطر عاطر ہوگا، امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ فیضان والا سے ضرور مستفیض ہوں گے، باقی والسلام مع الاکرام، فقط!

مورخہ دویم ربیع الثانی ۱۳۲۳ہجری　

مکتوب پنجم

بیگم سلطان جہاں بنام حضرت مولانا گنگوہی

حضرت مولانا نے مولانا محی الدین کی گذارش پر بیگم صاحب کے حسب خواہش، نیابۃً قبول فرمالی، یہ واقعہ، مولانا عاشق الٰہی کی اطلاع کے مطابق، ۵/یا ۶/ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ کا ہے۔ مولانا محی الدین قبول بیعت کی اطلاع بلکہ خوش خبری لے کر، بھوپال واپس گئے۔ قبول بیعت کی اطلاع سے بیگم صاحب کے دل کی کلی کھل گئی، قدرتی طور پر ان کو اس سعادت و عزت کے حصول کی انتہائی خوشی ہوئی اور بیعت کے بعد، جو کرنے کے کام اور معمولات، حضرت مولانا نے تجویز فرمائے ہوں گے، ان پر پوری طرح عمل کرنے کا ارادہ کیا اور اذکار و اوراد کی پابندی کا فیصلہ کرتے ہوئے، حضرت مولانا کی خدمت میں ایک خط اور ارسال کیا۔ یہ خط بھی منشی منصب علی صاحب نے لکھا تھا، وہی اس کو لے کر بھوپال سے گنگوہ پہنچے تھے۔ یہ خط

۶ / جمادی الاخری ۱۳۲۳ھ [۹/ اگست ۱۹۰۵ء] کا لکھا ہوا ہے، اس وقت حضرت مولانا کی آخری علالت، جو مرض وفات ثابت ہوئی، شروع ہو چکی تھی، اس وقت حضرت مولانا اس حال میں نہیں تھے، کہ ان کی خدمت میں کچھ پیش کیا جا سکتا، یا وہ خط پڑھ یا سن لیتے اور یہ بھی واضح نہیں، کہ بیگم صاحب کے یہ قاصد، حضرت مولانا کی حیات میں گنگوہ پہنچ گئے تھے یا مولانا کے جنازہ میں شریک ہوئے۔

بجناب فیض مآب، ہادی رموز شریعت وطریقت، ماحی شرک وبدعت

حضرت مولانا ومرشدنا ـــــ ادام اللہ فیوضہم

بعد سلام عرض مسنون عقیدت مشحون التماس ہے، کہ گرامی نامہ افاضت نامہ، مبشر قبول استدعائے عاجزۂ انام، ومشتمل نوید شمول، بسلسلۂ اربعہ مشائخ کرام، بادیگر مطالب ضروری الارشاد مشرف ورود لاکر، باعث ارجمندی دارین ہوا۔

میں، اس الطاف بزرگانہ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی، اللہ تعالیٰ جناب والا کو مسند ارشاد وافاضت پر تادیرگاہ متمکن رکھے، اوراد وظائف وغیرہ کے متعلق، جو ہدایات زیب رقم فرمائی گئی ہیں، باایں ہمہ افکار نظم ونسق ریاست، ومشاغل حکومت، بقدر امکان وفرصت زمان، ان کی پابندی والتزام میں کوشش کروں گی۔ **واللّٰہ ولی التوفیق وھو حسبی ونعم الرفیق**

مجھ کو امید ہے کہ جناب والا! اپنی دعاہائے روز وشبی وتوجہات قلبی سے، مجھ کو ہمیشہ یاد فرماتے رہیں گے۔ اس وقت خبر وحشت اثر ناسازی طبع مبارک، سمع خراش ہوئی، شافی حق جلد صحت عطا فرمائے۔ فقط

مؤرخہ ششم جمادی الاخرہ ۱۳۲۳ھ

دستخط بیگم صاحب

اس خط کی تحریر کے ایک دن بعد، حضرت مولانا گنگوہی کی وفات ہو گئی تھی، اس لئے بظاہر یہ والا نامہ حضرت مولانا کے ملاحظہ میں نہیں آیا ہوگا، اس لئے یہی خط آخری اور اس سلسلۂ مراسلت کا اختتام ہے۔